ضمیر اپنا اپنا
اندرا شبنم اندو

ضمیر اپنا اپنا

اِندرا شبنم اِندو

اسباق پبلی کیشنز، پونہ - سلسلۂ مطبوعات 61

کتاب : ضمیر اپنا اپنا

افسانہ نگار : اندرا شبنم اِندو

پتہ : B 1 - 9، میور بن اپارٹمنٹ، 1100، شیوا جی نگر، ماڈل کالونی، پونے 016 411- موبائل: 9422001711

سنِ اشاعت : ۲۰۰۸ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

صفحات : ۱۲۸

زیرِ اہتمام : اسباق پبلی کیشنز، پونہ

کمپیوٹر کتابت : مدنی گرافکس، پونہ- 26122855

طباعت : شری گنیش پریس، پونہ

ملنے کے پتے:

❖ اِندرا شبنم اِندو

B 1 - 9، میور بن اپارٹمنٹ، 1100، شیوا جی نگر،

ماڈل کالونی، پونے 016 411- موبائل: 9422001711

❖ اسباق پبلی کیشنز،

سائرہ منزل، 230/B/102، دِمان درشن، سنجے پارک،

لوہ گاؤں روڈ، پونہ ۴۱۱۰۳۲- مہاراشٹر

موبائل نمبر: 9822516338

فہرست

کہانیاں

ZAMEER APNA APNA

by

Indira Shabnam Indu

Organized by

Asbaque Publications
Saira Manzil, 230/B/102, Viman Darshan, Sanjay Park,
Lohgaon Road, Pune - 411 032 (M.S) India
2008

گفت باہمی

کہانی اور اِندرا شبنؔم

نذیرؔ فتح پوری

اندرا شبنؔم کی کہانیوں کا دوسرا اُردو مجموعہ 'ضمیر اپنا اپنا' عنوان سے پیش کیا جارہا ہے۔ پہلا مجموعہ 'عبادت' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوکر مقبول خاص و عام ہوا۔ اندرا شبنؔم کی کہانیوں کے پہلے مجموعے کا اُردو کے ادبی حلقوں میں پُرتپاک خیرمقدم ہوا تھا۔ جہاں تک کتاب پہنچی وہاں سے داد و تحسین کی صدا بلند ہوئی۔ فی زمانہ تنقید کی جگہ تاثرات کا رواج عام ہوگیا ہے۔ اُردو میں ناقدوں کا فقدان تو نہیں ہے لیکن جو بھی ناقدین ہیں وہ دور تک اور دیر تک دیکھنے کی بصارت سے محروم ہیں۔ بظاہر وہ قلم کار خوش نصیب تصور کیے جاتے ہیں جن کے فکروفن پر کوئی مشہور نقاد ایک آدھ صفحہ لکھ دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی تنقید نہیں ہوتی محض تاثرات ہی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے سچی اور ایماندارانہ رائے وہی ہے جو ایک مخلص قاری کے دل سے نکلتی اور قلم سے پھوٹتی ہے۔ اور وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنا ردِعمل تحریر کرکے تخلیق کار کی خدمت میں پیش کردیتا ہے۔ خلوص کی مہک میں بسی یہی تحریر تخلیق کار کے لیے کسی گراں مایہ تحفے سے کم نہیں ہوتی۔ 'عبادت' کی اشاعت پر ایسے ہی گراں قدر تحفوں سے اندرا شبنؔم کا دامن بھر گیا تھا۔ گویا 'کہانی پسندوں' نے ان کی کہانیوں کے اوّلین مجموعے کا خیرمقدم کیا تھا۔ اسی تناظر میں اندرا شبنؔم کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ 'ضمیر اپنا اپنا' عنوان سے پیش کیا جارہا ہے۔

اندرا شبنؔم کی کہانیوں کا جو سفر 'عبادت' سے شروع ہوا تھا وہ ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچا کہ اُن کے ضمیر کی آواز بن گیا۔ عبادت انسان کا ذاتی عمل ہے۔ بس اس لمحے کو چھوڑ

کر جب دعا کے لیے عابد کے ہاتھ اُٹھتے ہیں اور لب کھلتے ہیں اور وہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے خدا کے حضور دعا کرتا ہے۔ لیکن دعا کا یہی لہجہ جب ضمیر کی آواز بن کر بلند ہوتا ہے تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ وہ کسی فردِ واحد کے ضمیر کی آواز نہ رہ کر سارے عالم کے ضمیر کی آواز بن جاتی ہے۔ ایسی آواز جس کے ترازو میں نیکی اور بدی تولی جاتی ہے۔ ضمیر انصاف کی وہ کرسی ہے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سفاک سے سفاک انسان بھی جب ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہوتا ہے تو اعتراف اور تسلیم کا جذبہ اس کے دل میں اُبھر آتا ہے۔

اندرا شبنم ایک نرم دل اور زود اثر فنکارہ ہیں۔ ان کے ذہن میں کیمرے کی آنکھ آویزاں ہے۔ وہ جہاں اور جس ماحول سے گزرتی ہیں وہاں کے اچھے اور برے تمام مناظر کو اپنے کیمرے میں قید کر لیتی ہیں اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر ان تصویروں کی مدد سے تخلیقی منظر نامے مرتب کرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ منظر کبھی کسی کہانی کی صورت میں اور کبھی کسی نظم پارے کی صورت میں صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے چلے جاتے ہیں۔ 'ضمیر اپنا اپنا' میں شامل اکثر کہانیاں ایسی ہیں جنھیں منفرد کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہانیاں محض تصوراتی پیکر تراشی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ حقائق کے بطن سے پھوٹی ہوئیں ایسی صداقتیں ہیں جنھیں الفاظ کا لباس پہنا کر کہانی کا پیکر عطا کیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں سچ بولتی ہیں۔ حق کی صدا بلند کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار ہمارے اپنے سماج اور معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہیں پرورش پاتے ہیں۔ زندگی کی کڑوی کسیلی صداقتوں سے لبالب جیتے ہیں اور پھر ایک دن ایک عام آدمی کی طرح دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پریوں اور دیوتاؤں کی دنیا میں بسنے والے کردار نہیں ہیں۔ جہاں عقل کے خلاف کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ بلکہ سارا سب کچھ عقل کے دائرے میں ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کے کردار حقیقت کی دنیا سے متعارف کرائے ہوئے اپنا سفر پورا کرتے ہیں۔ اندرا شبنم کے قلم کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو بنانے اور سنوارنے میں اپنے پورے خلوص کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اپنے کرداروں پر

اندرا کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی، وہ انتہائی چابکدستی کے ساتھ اپنے کرداروں کو زندگی عطا کرنے کی سعی مسلسل کرتی ہیں۔ یہی ان کہانیوں کی خوبی ہے۔ یہی ان کہانیوں کی پہچان ہے۔ اندرا شبنم کا قلم مسلسل سفر میں ہے۔ وہ خود بھی سمت و رفتار سے بخوبی آشنا ہیں۔ یہی آشنائی انھیں مسلسل کامیابی کی بلندی عطا کرنے میں معاون ہوئی۔ اسی اُمید کے ساتھ ان کی کہانیوں کے تیسرے مجموعے کا انتظار ہے۔

پیش لفظ

قاضی مشتاق احمد

ایک زمانہ وہ تھا جب علم و ادب کی دیوانی لڑکیاں اپنے گھر والوں سے چھپ چھپ کر کہانیاں پڑھتی تھیں۔ مشہور افسانہ نگار سلطانہ مہر سے ان کی نانی نے کہا تھا، ''لڑکی! کہانیاں پڑھنا چھوڑ دے۔ جو کہانیاں پڑھتا ہے اس کی کہانیاں بن جاتی ہیں۔'' جب عصمت چغتائی کی کہانیاں چھپنے لگیں تو ادبی حلقوں میں یہ افواہ عام ہوگئی کہ یہ کہانیاں دراصل عصمت کے بھائی مرزا عظیم اللہ بیگ لکھتے ہیں۔ جدید فکشن کی بہت بڑی ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر نے جب اپنی کہانیوں کے پہلے مجموعے کے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کی خبر سنائی تو ان کے بھائی کے ایک دوست نے کہا، ''کتاب کے ساتھ ساتھ آپ ایک شرح بھی چھپوا لیجیے تا کہ پڑھنے والوں کو یہ سمجھ میں آ جائے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''ناری'' (عورت) کو ڈھول، گنوار، شودر، پشو کی طرح 'تاڑن کا ادھیکاری' سمجھنے والے سماج میں کسی خاتون ادیبہ کو اپنی برابری میں کھڑا رہنا کبھی پسند نہیں آیا۔ اردو ادب میں عصمت چغتائی وہ پہلی 'باغی ادیبہ' ہیں جنھوں نے لفظ 'دِماغ' پر شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے اعتراض پر جواب دیتے ہوئے کہا تھا ''جوش صاحب، دَماغ تو آپ کا ہے ہمارا تو 'دِماغ' ہی ہے۔'' جب 'لحاف' کے سلسلے میں عصمت چغتائی پر مقدمہ دائر ہوا تو مشہور ادیب میاں ایم۔ اسلم نے سمجھایا ''میں تمھیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں۔ شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو ایسی کہانیاں نہیں لکھنی چاہئیں۔'' عصمت نے بات کاٹ کر جواب دیا، ''بھیا! شروع میں میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ چڑے چڑیاں کی کہانی سے آگے نہ بڑھوں، لیکن آپ کی ''گناہوں کی راتیں''

پڑھ کر نیت خراب ہوگئی۔"

اِندرا شبنم بھی میری بہن ہے لیکن میں نے انھیں کبھی کوئی مشورہ نہیں دیا بلکہ ان کے اس جذبے کی تعریف کی کہ وہ ادب میں مصلحت کی قائل نہیں۔ ادب تو ایک آئینہ ہے اور ادیب سماج کو صرف آئینہ دِکھانے کا کام کرتا ہے۔ اِندرا کی کہانیاں بھی وہ آئینے ہیں جو معاشرے کو اس کی 'صحیح صورت' دِکھاتے ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ میں 'چندو' اور 'بے گھر' پڑھتے ہوئے عصمت چغتائی بڑی شدت سے یاد آ گئیں کیونکہ ان کہانیوں میں بھی وہ بیبا کی ہے جو عصمت کی کہانیوں میں نظر آتی تھی لیکن ایسی کوئی بات نہیں جو قانون کی گرفت میں آ جائے۔ 'دو عورتیں' اِندرا شبنم کے گہرے مشاہدہ کا نتیجہ ہے جو انھیں ایروڈا جیل میں وارڈن کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ملا۔ 'ضمیر اپنا اپنا' بھی ایک ہمیشہ یاد رہ جانے والی کہانی ہے۔ گناہ، ثواب، غلط، صحیح کا فیصلہ ہر انسان کا اپنا اپنا ضمیر ہی کرتا ہے۔ اختر الایمان کا ایک مشہور فلمی ڈائیلاگ ہے کہ "کسی کے قتل سے پہلے قاتل اپنے ضمیر کو قتل کرتا ہے۔"

اِندرا شبنم کے اوّلین افسانوی مجموعہ 'عبادت' کے پیش لفظ میں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ "ان کی کہانیوں میں کہیں بھی نعرہ بازی یا جھنجھلاہٹ نہیں بلکہ سرگوشیوں کا انداز ہے۔" یہ انداز ہنوز برقرار ہے البتہ تجربے نے انھیں شکر پارے میں کونین لپیٹ کر دینے کا ہنر سکھا دیا ہے۔ ادیب کا یہ ہنر ہونا چاہیے کہ وہ لفظوں کے ذریعہ ماحول کے پیش نظر تصور کو زندہ تصویر کی صورت میں پیش کرے۔ مثلاً اگر شبنم کا ذکر آ جائے تو وہ اس انداز میں کہ اس لفظ سے طراوت کا احساس بھی ہو۔

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم　　　　رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

اِندرا کی کہانیاں پڑھ کر فراق کا یہ شعر کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔ یہ ان کے فن کی ہنرمندی ہے جو انھیں ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت دینے کے لیے کافی ہے۔

اندرا شبنم : پختہ کار اور بالغ نظر افسانہ نگار

دیپک بدکی

سندھی، مراٹھی، ہندی اور اُردو میں لکھنے والی کثیر الزبان ادیبہ اندرا شبنؔم تقسیم ملک کا درد اور سندھی کلچر کے بکھراؤ کا کرب کئی برسوں سے صفحۂ قرطاس پر اُنڈیل رہی ہیں۔ وہ شاعرہ بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ کراچی، سندھ (پاکستان) میں جنمی اِندرا پوناوالا نے زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے، پرکھا ہے اور برتا ہے۔ اُٹھائیس سال معلّمہ رہیں، ایک سال ایروڈا جیل کے لیڈیز وارڈ میں وارڈن رہیں، ایک سال محکمہ رورَل پولیس میں مجرموں کی چھان بین کرتی رہیں اور پھر ایس ایس وائی یوگا کی ٹیچر رہیں۔ اس کے علاوہ انھیں ریکی اور روحانی معالجہ سے بھی کافی دلچسپی ہے۔

مشاہدات اور تجربات کی اس گونا گونی نے اندرا شبنؔم کو پختہ کار اور بالغ نظر افسانہ نگار بنایا ہے۔ موصفہ کی چھ تصانیف ہندی میں، چار سندھی میں اور تین اُردو میں پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔ اب اندرا شبنؔم ایک اور افسانوی مجموعہ 'ضمیر اپنا اپنا' قارئین کی نذر کر رہی ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'عبادت'، جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا جس میں نذؔیر فتح پوری افسانہ نگار کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"احساسات و تصوّرات کی روح پرور اور مسرور کن دنیا میں رہنے کے بعد بھی آپ نے حقائق کی سنگلاخ زمینوں سے اپنا رشتہ ہمیشہ مضبوط رکھا۔"

اسی مجموعے میں قاضی مشتاق احمد فرماتے ہیں :

''اِندرا شبنم ایک حساس فنکارہ ہیں۔ ان کے لیے ظلم، زیادتی اور ناانصافی کا تماشہ کھلی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے قلم کو تلوار بنا کر ان زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ اسی غیر معمولی حساسیت اور جذباتیت کی بدولت وَندنا اور پونم جیسے کرداروں نے جنم لیا ہے اور 'تتر بتر' جیسی کہانیاں اِندرا کے قلم سے رقم ہوئی ہیں۔ اندرا شبنم اپنے معاشرے پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ موجودہ سماج کی پیچیدگیوں کو انھوں نے کئی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ 'قدرت کا کرشمہ' میں وہ اپنے سماج پر یوں طنز کرتی ہیں کہ زلزلے سے مفلوج زدہ لوگوں کو ہم پل بھر کے لیے اخباروں کی سرخیاں اور ٹیلی ویژن کی زینت بناتے ہیں اور پھر انھیں ایسے فراموش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ گاؤں سے شہر تک کی طرف نقل مکانی کرنے کے بارے میں افسانہ نگار سوال اُٹھاتی ہیں :

''یہ باہر ملکوں کو بھاگتے ہوئے لوگ، یہ گاؤں سے بھاگ کر شہر میں آتے ہوئے لوگ، کیا صرف پیٹ بھر روٹی کے لیے آتے ہیں؟ یا رشتوں سے بھاگ کر یا آزادی اور صرف آزادی پانے کے لیے یا سچ مچ کوئی مجبوری؟ رنگین سپنے؟ پڑھائی؟ بھاگ کر شادی کرنے؟ کون سا مقصد منزل لے کر وہ شہروں میں آتے ہیں۔ گاؤں کو خالی کرتے ہیں اور شہروں کو بھیڑ سے بھرتے ہیں۔'' (بے گھر)

افسانہ نگار خود ایک عورت ہیں اس لیے عورتوں کے دُکھ درد کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں۔ ان کے نسائی کردار نرینہ عصبیت، جبر و ستم اور استحصال سے تنگ آ کر کبھی گاؤں سے شہر بھاگ جاتے ہیں (جا تو میرے لیے مرگئی)، اپنا پیار پانے کے لیے کئی صعوبتیں جھیلتے ہیں (ضمیر اپنا

اپنا) یا پھر مرد کی بے راہ روی کے تتبع میں خود اسی راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں (ایک رات)۔ ان کے کئی کردار جرائم پیشہ بھی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان جرائم پیشہ لوگوں سے افسانہ نگار کا واسطہ ایروڈا جیل میں پڑا ہو۔ 'سر پھرا' میں محبت و شفقت سے محروم کردار معصوم بچوں کا قتل کرتا ہے۔ 'ایک بدحواس پل' میں بیوی اپنے بٹے ہوئے شوہر کو زہریلا دودھ پلانے کی ناکام کوشش کرتی ہے اور 'دو عورتیں' میں جہاں ایک عورت باپ کے جنسی استحصال سے تنگ آ کر اُسے موت کے گھاٹ اُتارتی ہے وہیں دوسری عورت اپنی ماں کو اس لیے قتل کرتی ہے کیونکہ اس نے اپنی لڑکی کی عصمت کا سودا کرلیا ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ان کے یہاں عورت کا مجبور اور مظلوم چہرہ کسی نہ کسی روپ میں سامنے آتا ہے۔ البتہ ان صعوبتوں کے باوجود خوددار لکشمی بیوہ ہوکر بھی ہمت نہیں ہارتی اور 'نئے رشتے' کی منجو اپنی بہو کی تہمتوں سے تنگ آ کر اپنے خون کے رشتے کو خیرباد کہتی ہے اور پھر یتیموں کی اندھیری دنیا کو اُجالا کرنے میں مصروف ہوجاتی ہے۔

اِندرا شبنؔم کی کہانیاں پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہانی اپنے ساتھ لائی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ مربوط، کردار آس پاس کی دنیا کے مظلوم لوگ اور مکالمے فطری اور چست ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں قاری کو سوچنے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ ان کے ہاں انفرادی غم بھی ہے اور مجموعی الم بھی ہے۔ ان کے افسانوں سے چندایک اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆　جس نے پیار نہیں کیا وہ سوکھے پیڑ کے جیسا ہے۔ ایک بے جان مشین۔ وہ کسی کو پیار دے بھی نہیں سکے گا۔ جسے پیار نہیں ملا ہے وہ انسان بدنصیب ہے۔ (ایک بدحواس پل)

☆　اس کہانی کے مصنف سے میں پوچھتی ہوں آخر یہ کیا بات ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ اپنا گھر، اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر ایک گھر کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں؟ (بے گھر)

☆ بچاؤ والے وکیل نے کہا، ''یہ لڑکا ماں باپ کے واد وِوادوں کا اور آپسی جھگڑوں کا شکار بن کر سنکی، بھیانک سر پھرا ہو گیا ہے۔ اسے کم سے کم سزا دی جائے۔ (سر پھرا)

☆ کبھی مجھے گاؤں سے نفرت ہونے لگتی ہے تو کبھی شہر سے۔ کیا میری یہ نفرت کسی گاؤں سے یا کسی شہر سے ہے؟ یا سارے لوگوں سے؟ لیکن گاؤں اور شہر میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ (جا تو میرے لیے مر گئی)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو افسانوی مجموعہ 'ضمیر اپنا اپنا' اُردو ادب میں ایک دلچسپ اضافہ ہے اور ایک نئی جہت سے قاری کو روشناس کراتا ہے۔ آج جب کہ نثر لکھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں، میں اندرا شبنمؔ کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتا کہ وہ کڑی محنت کر کے ہمیں اپنے تجربوں اور مشاہدات سے مستفید کرتی ہیں۔

سری نگر　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　دیپک بدکی

۱۴ر دسمبر ۲۰۰۷ء

سفر حیات کی کہانی اور اندرا شبنم

رفیق جعفر

سفر حیات کا کٹھن سہی لیکن اگر کسی کو ادب سے دلچسپی ہوجاتی ہے تو کچھ آسانیاں درآتی ہیں۔ اس سلسلے میں ادب کی مقبول صنف ''کہانی'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہانیاں ہی ہوتی ہیں جو کہ انسانی شعور کو روشنی عطا کرتی ہیں۔ اپنے دکھ کو بانٹتی ہیں اور دوسروں کے درد والم سے آشنا کراتی ہیں۔ یہ شعور یہ شناسائی وقتی بھی ہوسکتی ہے اور دیرپا بھی۔ قاری یا سامع کی سمجھ بوجھ کے مطابق کہانی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہر کہانی میں کہانیوں کے کردار اپنی تہذیب، سنسکرتی اور مذاہب کو اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ نہ صرف اپنے ملک بلکہ غیر مما لک کی تہذیب، تاریخ، ماحول اور مذاہب سے واقفیت ہوتی ہے جس سے سماج اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے کے مواقع ملتے ہیں جو زندگی کے سفر میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ کہانی سننا یا پڑھنا انسانی فطرت میں شامل ہے۔

کہانی کار اندرا شبنم کی زندگی کا سفر کراچی (سندھ) سے شروع ہوا اور گنگا جمنی تہذیب میں اپنی ساری توانائیوں، نیرنگیوں اور المیوں کے ساتھ جاری ہے۔ ان کی زندگی کے سفر نے انھیں پہلے حساس پھر کہانی شناس اور اس کے بعد کہانی کار بنا دیا۔ ایک شاعرہ ہونے کی وجہ سے اختصار میں اپنی بات کرنے کے ہنر نے ان کے دماغ میں گھر کرلیا۔ اب وہ کہانی لکھتی ہیں تو نپے تلے پیمانوں میں ان کی کہانی کے تانے بانے نظر آتے ہیں۔ ابتداء پرکشش اور اختتام چونکانے والا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے بیچ کا وقفہ قاری کے لیے بوجھ نہیں ہوتا بلکہ دلچسپ اور تجسس آمیز ہوتا ہے۔ جس کہانی کار کی کہانیوں میں یہ اوصاف ہوں تو اس کی

کہانیوں کی پسندیدگی اور مقبولیت لازمی ہے۔ اِندرا شبنؔم ایک عرصے سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ ان کی کہانیاں اخبارات اور رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''عبادت'' کے نام سے پہلے ان کی مادری زبان سندھی میں شائع ہوا پھر ہندی میں، اس کے بعد اسی نام سے اردو میں شائع ہوا۔ یہ تینوں زبانیں محترمہ جانتی ہیں لکھتی پڑھتی ہیں۔ ان تینوں زبانوں میں شاعری بھی کرتی ہیں ان کے غالباً دس مجموعے مختلف زبانوں میں ادب کی دونوں اصناف میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں ان کی غزلوں کا مجموعہ، سرگوشیاں اور کہانیوں کا مجموعہ ''عبادت'' شائع ہوا۔ اردو کے حلقوں میں ان کی تخلیقات کی پذیرائی ہوئی۔ اب ''ضمیر اپنا اپنا'' عنوان کے تحت ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کہانیوں کا مجموعہ شائع ہو کر قارئین اردو کے ذوق کی تسکین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

''ضمیر اپنا اپنا'' کی کہانیوں میں فنی اعتبار سے اندرا شبنؔم ایک قدم آگے نظر آتی ہیں۔ ان کی حیات کے سفر کے ساتھ ان کے تخلیقی سفر میں بھی پختگی اور تجربہ کاری کے رنگ گہرے ہوئے ہیں۔ ''عبادت'' کی کہانیوں کے اسلوب اور ''ضمیر اپنا اپنا'' کے اسلوب میں جو فرق ہے وہ اندرا شبنؔم کی کہانی کا قاری محسوس کر سکتا ہے کہ کہانی پن تو دونوں ہی مجموعوں کی کہانیوں میں موجود ہے لیکن ان کی نئی کہانیوں کے رنگوں کی شوخیاں اور زبان و بیان کی کہکشاں قاری کو لبھاتی بھی ہیں، سمجھاتی بھی ہیں۔ نئے نئے کرداروں سے متعارف بھی کرواتی ہیں اور کہانی کے اختتام پر سوچنے کی دعوت بھی دیتی ہیں۔ اس نئے مجموعے میں تیرہ کہانیاں ہیں۔ تیرہ الگ الگ موضوعات ہیں اور ہر موضوع اپنا ماحول، اپنے کردار، اپنی زبان اور اپنا اسلوب رکھتا ہے۔

اندرا شبنؔم کی حیات کے سفر سے انھیں جو نئے نئے تجربات ہوئے مشاہدات سے سامنا ہوا۔ زندگی کے جن کرداروں نے انھیں لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کا اندازہ تو قاری کو کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ یہاں میں ان کی کچھ کہانیوں کی جھلکیاں اقتباسات کی شکل میں پیش کرنا

مناسب سمجھتا ہوں تا کہ اندرا شبنم کی کہانی کی کہکشاں سے اردو کا قاری آشنا ہو جائے اور وہ اس کتاب میں شامل کہانیوں کو شوق سے پڑھ سکے۔

درج ذیل اقتباسات اِندرا شبنم کی پانچ کہانیوں سے لیے گئے ہیں۔ ہر اقتباس سے کہانی کے موضوع کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اندرا شبنم کی ان کہانیوں کے زیادہ تر کردار اوسط یا غریب طبقے سے لیے گئے ہیں۔ اصل میں ۵ مسائل ان ہی طبقوں میں ناسور کی طرح پلتے ہیں۔ اور ان کی زندگیوں کا سفر تیز رفتاری کے ساتھ موت کی طرف گامزن رہتا ہے۔

کہانی کار اندرا شبنم حساس اور ایک نرم دل عورت ہے۔ انھیں اپنے وطن، اپنی قوم اور اپنے سماج سے پیار ہے۔ ان کی سوچ وسیع اور دل کشادہ ہے وہ سارے ہندوستانیوں کو ایک نظر سے دیکھنے کی عادی ہیں۔ ان کے فن میں نفرت کی چنگاریوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ان کی کہانیوں کا مرکزی موضوع پیار ہے صرف پیار، وطن سے پیار، زمین سے پیار، مذہب سے پیار، اپنوں سے پیار، غریبوں سے پیار، اچھوں سے پیار، بروں سے پیار، بس پیار ہی پیار۔ یہ شاید اس لیے کہ اندرا شبنم یہ جان چکی ہیں کہ آج کے اس اکیسویں صدی کے کمپیوٹر دور میں دنیا بارود کا ایک ڈھیر بن چکی ہے جس پر ہم سب بیٹھے ہیں۔ الغرض جب تک جئیں پیار سے جئیں۔ کیونکہ پیار ہی وہ مہان شکتی ہے جسے دیوی، دیوتا، گاڈ یا خدا کا نام دیا جاسکتا ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ اندرا شبنم کی یہ کہانیاں بھی سابقہ ''عبادت'' والی کہانیوں کی طرح پسند کی جائیں گی اور اُردو والے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے مزید اچھی اچھی کہانیوں کی امید رکھیں گے اور مجھے اندرا شبنم سے مستقبل میں اور بھی اچھی معیاری کہانیوں کے علاوہ ناولٹ اور ناولوں کی بھی امید ہے۔ خدا کرے میری امید یقین میں بدل جائے۔

''ایک ہی گھر کی تین عورتوں سے پیار، چندو اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا پھر بھی چندو

کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے جنت نشین بیوی کے فوٹو کی طرف دیکھا جو اسے خونخوار آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ اُس نے فوٹو کی طرف پیٹھ کر دی، آئینے کے سامنے کھڑا رہ کر اپنے بچے کچے بالوں کو ڈائی لگانے میں مصروف ہوگیا اور اس نے دیکھا کہ وہ بہت برسوں کے بعد زیادہ جوان اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بے فکری سے سیٹی بجانی شروع کردی اور نندنی کے رنگین خیالوں میں ڈوب گیا۔" (چندو)

"آج کل میں ممبئی میں رہتی ہوں اور ایک گھر میں نوکرانی کا کام کاج کرتی ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئی ہوئی لڑکی ہوں۔ ہمارا چھوٹا سا گاؤں۔ باپ دادا کھیتی کرنے والے کسان کوئی زمانہ تھا سب کا گزارا کھیتی پر ہی ہوجاتا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے مدرسے میں ساتویں آٹھویں پڑھ کر کام پر یعنی کھیتی باڑی میں سب جٹ کر کام کرتے۔ دھیرے دھیرے لوگ شہروں میں روٹی، کپڑا، مکان سے زیادہ پانے کی خواہش میں بھاگنے لگے۔"

(جا تو میرے لیے مرگئی)

"آخر یہ کیا بات ہے، لاکھوں کروڑوں لوگ، اپنا گھر، اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر ایک گھر کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔" (بے گھر)

"گھر والوں کو جب بھنک پڑی گوپال مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اسے سبھی ڈانٹنے، پھٹکارنے لگے اور پھر اسی وقت گھر والوں کے پاس میرے لیے ایک رشتہ بھی آگیا۔ وہ لڑکا میری عمر سے لگ بھگ گیارہ سال بڑا تھا۔ کمپیوٹر انجینئر تھا۔ اچھا خاصا کماتا تھا اور میں بھی ضد میں آکر ہاں کر بیٹھی۔ گوپال کو نیچا دکھانے کے لیے۔" (ضمیر اپنا اپنا)

"اس نرک اور پاپ کی دنیا سے یہ گھر اس کی دیواریں، اس کی چھت اس کی سیمائیں، سکھ دکھ، سب بہت اچھے ہیں۔ وہ بدبدائی جب جاگو تب سویرا، اور اس نے ہمیشہ کے لیے اس خیال کو دل سے نکال دیا کہ وہ طوائف بنے گی" (ایک رات)

دل سے دلوں تک

مصنفہ کے قلم سے

اِندرا شبنم اِندوؔ

میری نثر اور نظم دونوں طرح کی تخلیقی کاوشوں کا محور و مرکز میرے اِرد گرد بکھرا اور پھیلا ہوا ماحول ہی رہا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی اپنے افکار میں ڈھال کر پیش کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ جن کرداروں کی میں تخلیق کرتی ہوں پچھلے جنم ہی سے ان سے میرا تعلق رہا ہے۔ اس لیے میں تصورات کی دنیا میں گم ہونے کی بجائے حقائق کی دنیا میں محوِ سفر رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔

میری زندگی قلم و قرطاس کی آبیاری میں سرگرداں ہے۔ میں لکھتی ہوں اور بس لکھتی ہی چلی جاتی ہوں۔ جب بھی میری نئی کتاب کا اجراء ہوتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے یہ میری پہلی کتاب ہے۔ کیونکہ اتنے سارے کرداروں کو کہانی کا روپ دینے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے نئے کردار پھر میرے سامنے رونما ہونے لگے ہیں کیونکہ حالات و ماحول میں رونما ہونے والی تلخیاں، درد، مسرتیں، خوش فہمیاں، پریشانی، پشیمانی، ٹوٹنا، جڑنا، بکھرنا، رشتوں کا دوغلہ پن، پیار، ممتا، بھائی چارہ، سب کچھ جوں کا توں ہے۔ اسی تناظر میں میرا قلم بھی متحرک رہتا ہے۔ ایک آگ سلگتی رہتی ہے، بھڑکتی رہتی ہے۔ دھڑکتی رہتی ہے میرے اندر - میرے باہر۔ ایک لاوہ بہتا رہتا ہے۔ میں ایک معنی خیز مسکراہٹ اور زیرلب تبسم کے ساتھ ان حالات کا استقبال کرتی ہوں۔

میں زندگی سے نہ ناراض ہوں نہ ناخوش۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی شکایت نہیں۔ میں نے مایوسی کو کبھی اپنے گلے کا ہار نہیں بننے دیا۔ پیار، اپنائیت، مسرتوں سے لبالب زندگی جینا ہر

کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن یہی چیزیں بارود سے بھری اس دنیا میں جینے کی طاقت عطا کرتی ہیں۔ اس زہریلے ماحول میں جینے، ہنسنے اور مسکرانے کے لیے یہی طاقت سہارا دیتی ہے۔

میں 'استری وادی' قطعی نہیں ہوں۔ میں مردوں کی عزت کرتی ہوں۔ مرد جو محبت، دوستی اور وفاداری کی علامت ہوتے ہیں، ایسے مردوں کے لیے میرے دل میں بڑا آدر ہے، سمان ہے، وقار ہے۔ میں ایک بیٹی ہوں۔ ایک بہن ہوں، ایک ماں ہوں۔ ایک ذمہ دار تخلیق کار ہوں۔ مردوں کے لیے یہی میرا نظریہ ہے۔ میری رائے ہے۔ عورت پہلے مجبور تھی اب نہیں ہے۔ اب لاچاری اور بے بسی کے لیبل عورت کے وجود سے اُتر چکے ہیں۔ عورت اب دھرتی کا بوجھ قطعی نہیں ہے۔ آج کے زمانے کی عورت اپنی اہمیت بخوبی سمجھتی ہے۔ اسے اپنی حدوں کا علم ہے۔ وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں۔

سندھی میری ماں کی زبان ہے۔ اس لیے میں سندھی میں سوچتی ہوں۔ ہندی اور مراٹھی میرے آنجہانی بھائی 'جواہر بھیا' کی دین ہے مجھے۔ اُردو میرے سب سے بڑے بھائی گھنشیام داس کی زبان ہے۔ اس عقیدت اور محبت نے میرے دل میں اُردو کے لیے پیار جتایا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے ان بزرگوں کی تقلید میں سندھی، ہندی، مراٹھی اور اُردو کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔

میری بیٹی پنکی (گایتری) بیٹا راکی اور بہو۔ علاوہ ازیں میرے شوہر کو محبتوں بھرا سلام پیش کرتی ہوں اور ان تمام کی شکرگزار ہوں۔ میں جہاں لڑکھڑاتی ہوں میرے پریوار کے لوگ مجھے تھام لیتے ہیں۔

میری فہرست میں دشمن نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں خود ہی سرتاپا پیار کی بوچھار میں بھیگی ہوئی ہوں، کسی صوفی، سنت اور قلندر کی طرح۔ میرا سب سے بڑا دوست اوپر والا ہے جو اس کائنات کا تخلیق کار ہے۔
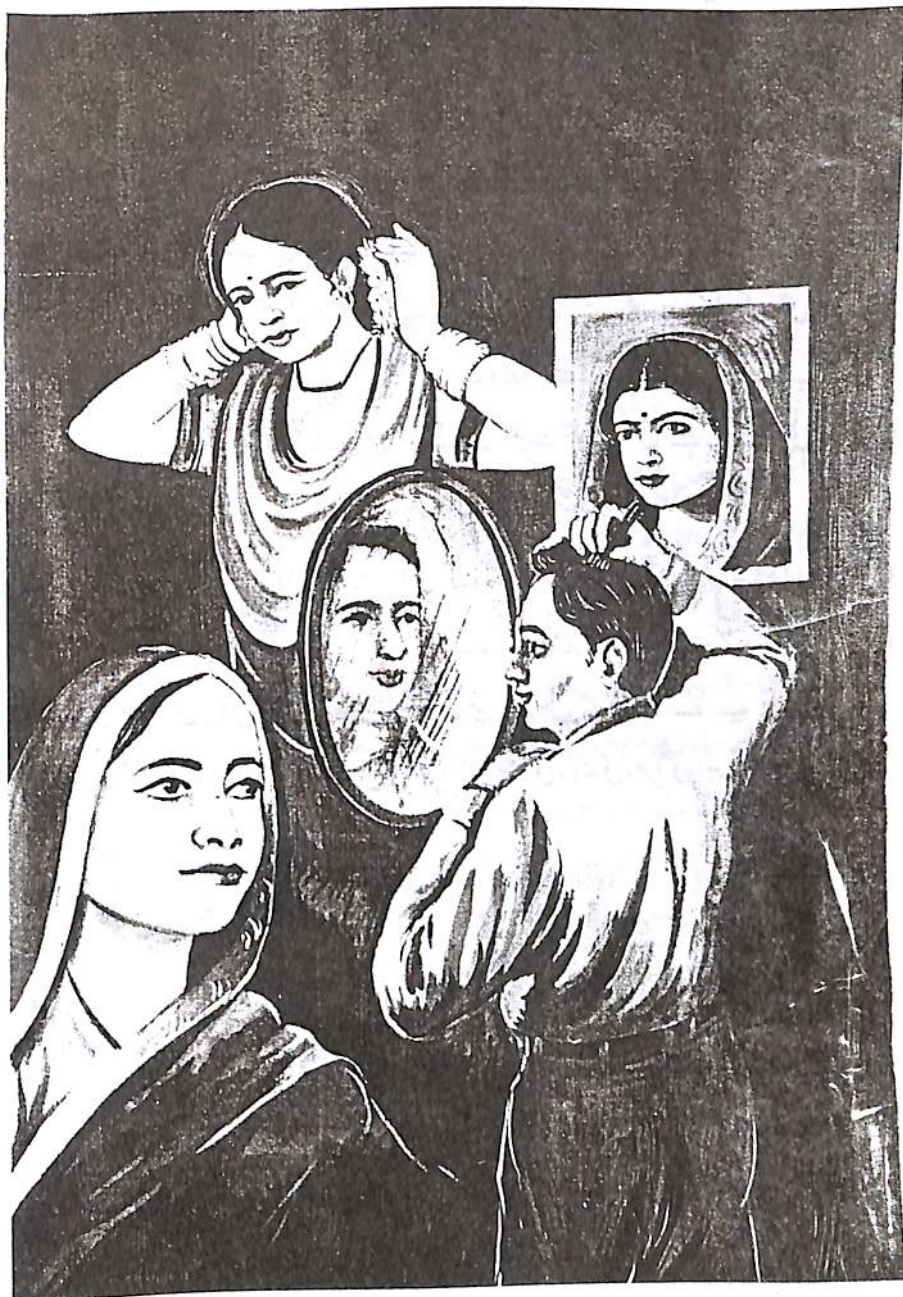
چندؤ

چندو

وہ اپنی بالکنی میں کھڑا چاروں طرف دیکھنے لگا کہ گزرے پچیّس سالوں میں کون کون سے بدلاؤ اس کی سوسائٹی میں آس پاس ہوگئے ہیں۔!

بہت کچھ بدل گیا ہے۔ سامنے والے گھر کے دو چھوٹے بچے اب بڑے ہوکر پڑھائی پوری کر کے امریکہ چلے گئے۔ ان کی ماں اب اکیلی ہی رہتی ہے۔ بیوہ ہوگئی ہے۔ پڑوس میں رہنے والی عورت اپنے بیٹے بہواور پوتے کے کار ایکسیڈنٹ اور اپنے شوہر کے گزر جانے کی وجہ سے بیماری کو گلے لگا کر دھیرے دھیرے موت کے قریب جارہی ہے۔

شریمتی پنجوانی اپنی گود سُنی ہونے کی وجہ سے کوئی بچہ گود نہ لے کر 'بنٹی' نام کی کتیا کو پال رہی تھی۔ مگر کتیا بھی ایک حادثے کی شکار ہوگئی۔ یہ صدمہ شریمتی پنجوانی برداشت نہیں کر سکی اور پاگل ہوگئی۔ بچے تو اسے 'کتیا بنٹی' کے نام سے ہی چڑھاتے ہیں۔

وہ تالا لگے ہوئے گھروں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ ہر گھر کا الگ الگ افسانہ ہے۔ اس کی سوسائٹی میں لگ بھگ تیس گھر ہیں۔ اور خاموشی سے وہ دیکھتا آرہا تھا۔ ہر غم ہر خوشی اسے سوسائٹی میں رہنے والوں کے اپنے اپنے مسئلے، ہر گھر کی الگ الگ کہانی۔

اس کے گھر کی بھی تو ایک کہانی ہے۔ چندو نے ٹھنڈی سانس بھری اور بالکنی سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں ٹکرائیں اس کی بے حد حسین اور خوبصورت بیوی کی آنکھوں سے، جو فوٹو بن کر ایک فریم میں قید تھی۔ اس کی جنت مکانی بیوی کمل!

چندو سوچ میں ڈوب گیا! اس کا نام کمل تھا لیکن چندو اسے ببلی کے نام سے پکارتا تھا۔ اس کے ناز نکھرے، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اس کے ساتھ توتلی باتیں کرنا بالکل بچی جیسی تھی۔ وہ

اپنے میاں کے سامنے ایک ننھی بچی جیسا سلوک کرتی رہتی تھی۔ ٹھمکتی، گنگناتی گاتی رہتی تھی۔

ویسے تو کمل ایک استانی تھی۔ ریڈیو پر گائیکی، ڈراموں میں حصہ لینے والی سنجیدہ خاتون، تین بچوں کی ماں تھی، جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

چندو کو یاد آنے لگا اور وہ ماضی کی یادوں میں ڈوبتا گیا۔ کمل تب تیرہ چودہ سال کی بچی تھی اور گنگا کی چھوٹی بہن نندنی، کمل کی خالہ جو اس سے چار پانچ سال بڑی تھی، وہ دونوں ساتھ ہی بڑی ہو رہی تھیں۔ نندنی کا اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر ہمیشہ آنا جانا رہتا تھا تب چندو کمل کے گھر میں پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتا تھا۔

ببلی (کمل) کے والد کا نام گووند رام تھا۔ ان کی شادی بھی بچپنے میں ہوئی تھی۔ گووندرام کی بیوی بھی ان کی عمر سے آدھی تھی۔ اس کا نام گنگا تھا۔ گنگا بھی اپنے شوہر گووندرام کی گود میں کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔

چندو جب گووند رام کے گھر میں رہنے آیا تب گنگا کو ایک لڑکی تھی کمل۔ چندو گووند رام کی بیوی گنگا کی پاکیزہ خوبصورتی پر مر مٹا۔ اتنی خوبصورت عورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ دودھ میں گلابی رنگ ملایا جیسا تھا۔ پانی بھی پیتی تو اس کے گلے سے دکھائی دیتا تھا۔ اور خصوصاً پان کھانے پر اس کے گلے سے گزرتا ہوا لال رنگ دکھائی دیتا تھا۔ لمبے گھنے بال، آنکھوں میں نشہ، مستی! سِتار کے تار چھیڑنے سے مانو نس نس میں آبِ حیات گھل جاتا۔

لیکن گنگا شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں تھی۔

گنگا کا پیار، اپنا پن سب سے ہل مل کے رہنا، ان سب باتوں نے دونوں کے بیچ چوری چھپی والا پیار پیدا کر دیا۔ گنگا اور چندو کی عمر بھی تو ایک سی ہی تھی۔

چندو کی محنت لگن اور خود اعتمادی کی وجہ سے اسے امریکہ میں بہت بڑے عہدے کے

لیے بلوایا گیا۔ اس کے بعد اس نے پونا میں ایک گھر بھی خرید لیا تھا۔ اور بہت سارا پیسہ بینک میں جمع کر لیا تھا۔

گووند رام کے سارے خاندان کو اس سے بچھڑنے کا دکھ ہو رہا تھا۔

خیر سونے جیسا لڑکا اونچے قد والا، اچھے گھرانے کا، بنا کسی خراب عادت والا کنوارا لڑکا۔ گووند رام کو اپنی لڑکی کمل کے لیے لائق دولہا محسوس ہوا۔ لڑکی گھر میں راج کرے گی۔ سب لوگوں کو یہ رشتہ پسند آیا۔

تب کمل کی عمر صرف تیرہ چودہ سال کی تھی۔ چندو سے آدھی عمر کی، پھر بھی گنگا کچھ بھی کہہ نہ سکی۔ گنگا کا پیار سماج کے دائرہ میں نہیں تھا سو وہ کیا کہہ سکتی تھی؟ اس کی خاموشی کو ہاں سمجھا گیا۔

گووند رام کے گھر والوں نے چندو سے کمل کا رشتہ اس لیے جلدی میں طے کیا کہ وِدیس جانے سے کہیں چندو کسی گوری میم سے شادی کر کے واپس نہ لوٹ آئے۔ گنگا نے اپنی رضامندی دے دی۔ جمائی راجا کی شکل میں ہی سہی چندو اس کا کچھ تو رہے گا۔

دونوں نے سمجھوتا کر لیا۔ کسی نہ کسی رشتے میں بندھ کر دونوں جڑے رہیں گے۔ اور اپنی محبوبہ گنگا کی بیٹی سے چندو شادی کرنے کے لیے رضامند ہو گیا۔

یہاں چندو اور گنگا کا پیار اور ادھر نندنی کے دل میں بھی چندو کے لیے کھنچاؤ ہونے لگا تھا۔ لیکن نندنی بھی من مسوس کے رہ گئی۔ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لا نہ سکی۔ چندو کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ نندنی بھی اسے دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی۔

نندنی چندو سے سچ مچ پیار کرتی تھی۔ اس لیے اس نے بڑوں کے فیصلے میں رکاوٹ نہ ڈالی اور اپنے گاؤں چلی گئی۔ جہاں اس کا اپنا ایک گھر تھا۔ اور وہاں پر تعلیم کے ساتھ نوکری کرنے لگی۔ اور کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کمل (ببلی) کو سر سے پاؤں تک سونے سے بھر کر چاندی سے چمکا کر چندو سے شادی کروا دی گئی۔

کمل سے شادی کے لیے کوئی بھی رائے نہیں لی گئی۔ کیونکہ وہ اتنی سمجھ دار نہیں تھی۔ معصومیت اور بچپن سے بھری ہوئی معصوم کمل کو صرف اس میں ہی خوشی تھی کہ اپنے جانے پہچانے چندو انکل سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور ڈھیر ساری خوبصورت ساڑیاں مل رہی ہیں۔ سونا، ہیرے موتیوں سے اسے سجایا جا رہا ہے۔ وہ خوبصوت گڑیا سی لگ رہی ہے۔

باہر ملک اور امریکہ کی باتیں سن کر وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ اسے شادی کا مطلب ہی نہیں معلوم تھا۔ اسے لگا کے اس کے انکل کے ساتھ میں جو اس کے گھر میں پیئنگ گیسٹ بن کے رہتے تھے وہ رہے گی۔ اور پاپا کی جگہ پر چندو انکل اس کے ناز نکھرے اور لاڈ پیار پورے کریں گے۔ اس کی سمجھ کی حد اور اس کی عمر اتنی ہی تھی۔ شادی ہوگئی اور دونوں امریکہ روانہ ہو گئے۔

فون کی گھنٹی بجنے سے چندو کے خیالات کی کڑی ٹوٹ گئی۔ اس نے خود ہی چائے بنائی اور چائے پیتے پیتے پھر سے یادوں کے سمندر سے ایک اور لہر اُبھر آئی اور چندو کو سوچ میں شرابور ہوگئی۔ امریکہ میں بہت سال گزارنے کے بعد جب چندو اپنے گھر والوں کے ساتھ بھارت لوٹ آیا تب اس کے بچوں کی تعلیم پوری ہو چکی تھی۔ وہ بڑے ہو چکے تھے۔

بھارت پہنچنے کے کچھ دن بعد دونوں لڑکیوں نے اپنی خواہش کے مطابق لائق لڑکوں سے شادی کر لی۔ ماں باپ نے صرف ان کی خواہش کا ساتھ دیا۔ دونوں لڑکیوں نے شادی کے بعد الگ الگ شہروں میں گھر گرہستی جمائی۔ لڑکے کی بھی شادی ہوگئی اور اس کو اچھی تنخواہ پر ناسک میں نوکری مل گئی۔

اب کمل اور چندو دونوں ہی پونہ میں اکیلے رہ گئے۔ اپنا وقت گزارنے کے لیے کمل

نے تعلیم دینی شروع کی ۔ موسیقی، ڈرامہ اور مصوری میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کے پروگرام اسٹیج اور آکاشوانی پر مشہور ہونے لگے۔ چندو بھی رٹائیر ہوگیا تھا۔ اس کا خاندان پھلنے پھولنے لگا تھا۔ چندو دادا اور نانا بن گیا تھا۔ اس طرح اس کے خاندان کا شجر بڑھنے لگا تھا۔

اچانک! ایک دل دہلا دینے والی خبر نے سب کو چونکا دیا۔ گووند رام کا انتقال ہوگیا۔ اب بیوہ گنگا گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔

گنگا کا خیال تھا کے وہ کچھ مہینے بیٹی اور داماد کے ساتھ رہے گی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں! پونہ میں گنگا اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہ کر اپنے دل کے زخموں کو بھلانے کی کوشش کررہی تھی۔

کچھ سالوں کے بعد چندو نے گنگا کے لیے اپنے گھر کے پاس والا گھر خرید لیا۔ دونوں خاندان الگ الگ رہتے ہوئے بھی مانو ساتھ ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

کمل کی ماں گنگا ہر حال میں اس سے زیادہ خوبیوں کی مالک تھی۔ خوبصورتی، اچھی صحت، لذیذ کھانا بنانا، موسیقی، بھجن اور اس کا خاندانی رہن سہن اپنی خوبیوں سے آس پاس کی عورتوں کے دلوں میں وہ گھر کرگئی۔ عورتوں کو اس کے ساتھ رہنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔

دھیرے دھیرے کمل کے دل میں اپنی ماں کے لیے حسد بڑھتا جارہا تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ ایک عورت کو دوسری عورت کی خوبیاں دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹن اور جلن پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور اس کے بارے میں حسد، نفرت اور پھر بُرے الفاظ استعمال کرنا۔ اسے وہم ہوگیا کہ اس کا شوہر چندو بھی اس کی ماں گنگا کو بہت پیار اور عزت دے رہا ہے۔ اور یہ دیکھ کر تو وہ جل کر خاک ہوگئی۔

بڑی عمر والے بوڑھے خاوند کا جھکاؤ اس کی بوڑھی ماں کی طرف بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اور اتفاق سے کچھ پرانے خطوط بھی کمل کے ہاتھ لگے۔ جوان لوگوں نے جوانی کی عمر میں ایک دوسرے کو لکھے تھے۔

کمل کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا اور اس کو دل کا دورہ پڑا۔ اس نے بستر پکڑ لیا۔ بہت علاج کرنے کے باوجود اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی۔

کمل کی ماں گنگا کمل کی عیادت اور دھیان رکھنے کے لیے اس کے ساتھ رہنے لگی۔

کمل کے دل کی حالت بالکل خراب ہوگئی تھی۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یہ سوچ کر کمل نے اپنی ماں گنگا کو اپنے عاشق مزاج بوڑھے شوہر سے دور گاؤں میں بھجوادیا۔ بہت سارے علاج کرنے کے باوجود بھی اس کی بیماری بڑھتی گئی۔ کیونکہ اس کا دل پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ رشتوں سے اس کا بھروسہ اُٹھ چکا تھا اور وہ جینے کی آرزو چھوڑ چکی تھی۔ یہاں تک کہ اسے کینسر نے آدبوچ لیا۔ اس کے ٹھیک ہونے کی ذرا بھی امید نظر نہیں آرہی تھی۔

آخر رشتہ داروں کی صلاح سے کمل کی خالہ نندنی کو بلوایا گیا۔ اور گنگا کے گھر میں رکھا گیا۔ نندنی نے کمل کے گھر کی کایا ہی پلٹ دی۔ تین سال سے گندگی اور بیماری سے بھرا ہوا گھر کا ماحول ہی بدل دیا۔ کمل کی طبیعت تھوڑی تھوڑی ٹھیک ہونے لگی۔

قسمت کے بھی عجیب کرشمے ہیں۔ اب کمل کو اپنی خالہ اور شوہر کے رشتوں میں بھی کھوٹ نظر آنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کی خود دشمن بن گئی تھی۔ جو ہر حال میں ٹھیک ہونا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس کا عقیدہ سارے رشتوں سے اٹھ گیا تھا۔

چندو کی عمر پچھتّر سال کی تھی اور وہ تھی کہ لگاتار شک کا شکار بن کر اپنی زندگی کی ڈور کو کاٹتی چلی جا رہی تھی۔ رشتوں کی گھٹیا اور بدصورت شکل دیکھ کر اس سنسار سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس لیے اس کی زندہ رہنے کی خواہش بالکل ختم ہوتی جا رہی تھی۔

آخر شک اس کے رگ و پے میں بس گیا۔ بہت ساری بیماریوں میں گھِر کے اور اپنے بوڑھے شوہر اور خالہ کے رشتوں پر شک کرتے ہوئے گھٹ گھٹ کر کمل نے اپنی جان گنوا دی۔

اپنی بیوی کا یوں شک کا شکار ہوکر دنیا سے اٹھ جانا اس کا بیمار جسم، تڑپتی آرزوئیں، ڈوبتی آواز کی یاد کرنے سے چندو کا جی بھر آیا۔ آنکھیں ڈب ڈبا گئیں۔ اور کمل کا فریم جڑا ہار چڑھایا ہوا فوٹو اسے رلانے لگا۔ دل کو بہلانے، یادوں کو دوسری سمت میں لے جانے کے لیے وہ بالکنی میں چلا آیا۔

اتنے میں اس کی نظر سامنے والے گھر پر پڑی جہاں اس نے دیکھا اس کی ساس کی بہن نندنی بالوں میں پھول گونتھ رہی تھی اور منہ پر پاوڈر لگا رہی تھی۔ چندو کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ شرمانے لگی۔ حیا سے اس کے گال لال لال ہونے لگے اور وہ شرما کے اندر والے کمرے میں بھاگ گئی۔ بڑی عمر والی نندنی چندو کو سولہ سترہ سال کی عمر والی نظر آنے لگی۔ آج چندو نے اس لمحے میں نندنی کی آنکھوں میں وہ سب کچھ دیکھ لیا جو شاید نندنی نے بچپن سے ہی اس سے چھپا کر رکھا تھا۔ گنگا سے پیار، اس کی بیٹی کمل سے شادی اور اپنی ساس کی بہن نندنی سے عشق۔۔۔!

ایک ہی گھر کی تین عورتوں سے پیار۔۔۔! چندو اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا پھر بھی چندو کے لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے اپنی جنت مکانی بیوی کے فوٹو کی طرف دیکھا جو اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس نے اس فوٹو کی طرف اپنی پیٹھ پھیر دی۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر اپنے بچے کچے بالوں کو ڈائی لگانے میں مشغول ہو گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ بہت سالوں کے بعد زیادہ جوان اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بے فکری سے سیٹی بجانی شروع کر دی اور نندنی کے رنگین خیالوں اور خوابوں میں ڈوب گیا۔

دہلیز

دہلیز

میں تھکی، ٹوٹی، پریشان سی کھڑی ہوں! ایک سوال کے بیچ رشتوں کو انکار کرنے کی حالت میں! اپنے بارے میں کچھ سوچنے کو مجبور کشمکش سے بھری ہوئی، انصاف کے ترازو سے رشتوں میں کیا غلط ہے، کیا کیا صحیح کو تولتی ہوئی۔

دُکھ دینے والے حادثوں کا جمگھٹ سا لگا ہوا ہے میری زندگی میں۔ ایک حادثے میں میرا جوان لڑکا اپاہج ہو چکا ہے۔ اس حادثے کو تین سال بیت چکے ہیں۔ ان تین سالوں میں کتنے طوفان آئے۔ میری بہو، بیٹے کے بیچ جھگڑے اور پھر میری بہو کا اپنے بچے کو لے کر الگ ہو جانا۔

بستر پر پڑا ہوا میرا بیٹا، چڑچڑا، دن رات خودکشی کا خیال کرتا ہوا۔ اپنے اپاہج ہونے کی وجہ سے اپنے آپ پر اور آس پاس کے سبھی لوگوں پر غصّہ کرتا ہوا۔ بار بار اُس منحوس حادثے کو کوستا ہوا۔ یہ سب یاد کر کے جیسے آدھا پاگل ہو گیا ہو۔

ممبئ پونہ ہائے وے پر کار حادثے میں اُس کا جسم چھلنی چھلنی ہو گیا۔ نہ جانے اُس کی جان کیسے بچ گئی تھی۔

ایکسیڈنٹ کے بعد ان تین سالوں میں کاروبار میں نقصان ہونے کی وجہ سے میرے شوہر کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اور اُس سانحے سے ذہن کو چھٹکارا دلانے کے لیے انھوں نے شراب کا سہارا لیا اور انھیں اس کی بُری عادت پڑتی گئی۔ جس سے وہ دماغی اور جسمانی طور پر بدحال ہو گئے اور چڑچڑے بھی ہوتے گئے۔

بے حساب شراب اور چڑچڑے پن کی وجہ سے باپ بیٹے میں ہمیشہ جھگڑے ہونے

لگے۔ پورا گھر مانو جہنم بن گیا جس میں رہ پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

میرے ذہن پر ماضی کی یادیں دستک دینے لگیں اور یاد آنے لگے وہ سنہرے دن، وہ پیارے پل۔ تین سال پہلے بڑے چاؤ سے، بیٹے کی شادی ایک پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی سے کردی تھی۔

میری بہو بچپن سے ہی ہاسٹل میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کے میکے کے سب لوگ اکثر گھر سے الگ ہاسٹل میں رہتے تھے اور ایک آزاد نجی زندگی جینے میں بھروسہ رکھتے تھے۔ ڈھیر سارا روپیہ کمانا اور شان وشوکت سے رہنے والے ظاہری شان کے پجاری تھے۔ میری بہو کنچن بھی اسی سوچ کے ساتھ پلی بڑھی تھی۔

بیٹا ساگر، کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی پتنی کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ بہو رنگین سپنے ڈھیر ساری خواہشیں، آرزوئیں اور امیدیں لے کر اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔ شاید اُس کی زندگی منصوبہ بند تھی۔ پوری منصوبہ بند۔ سب کچھ شادی سے پہلے ہی طے تھا اُسے الگ ہی رہنا تھا۔ اپنے لیے ہی جینا تھا۔ نہیں طے تھا تو اُس کا گھریلو کاموں میں یا اُس کی اپنی کمائی میں دلچسپی۔

کچھ دنوں کے بعد، ساگر ایک دن تمتماتا ہوا، غصّے سے بھرا، گھر میں قدم رکھتے ہی، پتاجی پر گرج برس کر کہنے لگا، ''میں نے قرض پر الگ مکان لے لیا ہے۔ میری بیوی اور میں اب آپ بوڑھوں کی تو تو میں میں سے اوب گئے ہیں۔''

میرے بیٹے ساگر نے گہنوں کا ڈبہ الماری سے نکال لیا۔ کچھ مزدوروں کو جو باہر کھڑے تھے، انھیں گھر کا کچھ سامان اُٹھانے کو کہہ دیا اور سارے شیئر اٹھا کر لے گیا۔

میرے شوہر نے گالیوں کی بوچھار کردی اور اُسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا لیا۔ دونوں باپ بیٹے میں ہاتھاپائی کی نوبت آ گئی۔ چھڑانے کے لیے مزدور اور آس پاس کے پڑوسی گھر میں گھس آئے۔ اچھا ہوا پولیس کو بلانے تک بات نہیں پہنچی۔ یہیں پر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

بہو کے خواب اب پورے ہو رہے تھے۔ بیٹا ساگر، بہت ساری الگ الگ چکیوں میں پیتا پیتا اپنے اور بیوی، اور بیوی کے خاندان کے سپنے پورے کرنے میں جٹ گیا تھا۔

اس کار حادثے نے اُسے ایسا کچھ دِکھایا اور سکھا دیا۔ پرندے کے پر ٹوٹ گئے، بھاگتی ہوئی اُس کی ٹانگیں رُک گئیں۔ وہ اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ اپنا بنگلہ، کار، اُس کا اپنا مستقبل سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اُس کے اور بہو کے رشتے میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

گھریلو قسم کی دِکھنے والی اور گھریلو مکھوٹا لگائی ہوئی وہ لڑکی خدا اور قسمت کے فیصلے منظور کرنے سے عاجز تھی۔ اپنے شوہر کا اپاہج ہوجانا اور پوری معیشت کا ڈانواڈول ہوجانا، بہو کی برداشت کے باہر تھا۔ دونوں میاں بیوی کے بیچ اُٹھتے طوفان نے بہت خطرناک موڑ لے لیا۔

قسمت کی کروٹوں کو کنچن سہہ نہیں پائی۔ دکھوں سے بھری نصیب کی کالی رات کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

کاش! ہر عورت دھرتی ماں جیسا صبر رکھ پائے۔ نصیب کی کالی رات کے بعد اُمید کا سورج ضرور طلوع ہوتا ہے۔ اس بات پر بھروسہ رکھے۔

میرا پوتا روہت چھوٹا بچہ، حالات کی چپیٹ میں آ گیا۔ اُسے فٹ آنے لگے۔ اور پھر میری بہو قانونی طریقے سے طلاق لے کر سارے رشتے توڑ کر اپنے بیٹے روہت کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

میری لڑکی سُدھا جو اب تک کنواری ہی تھی۔ گھر کی ذمہ داریاں اُسے باندھ رہی تھیں۔ اُس کا تبادلہ بنگلور میں ہوگیا۔ پچھلے دو سالوں سے وہ وہیں رہ رہی ہے۔

چھٹیوں میں گھر آنے سے وہ اکثر کتراتی رہتی۔ میں بھی اُسے زبردستی نہیں کرتی۔ کس دل میں اُسے بار بار بلاؤں؟ اس کا جیون بھی تو سکھی نہ تھا۔ محبت کا رشتہ ٹوٹنے سے اور رشتوں کی سڑاند نے اُس کا دل زخمی کر دیا تھا۔ بٹیا اپنی ہی ذاتی زندگی کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

وہ ننھی سی جذباتی لڑکی کافی پریشانیوں سے بھری زندگی گزار رہی تھی۔ پیار، سچے پیار کو تلاشتی رہتی اور کھوجتی رہتی تھی۔ میں اُسے اس گھر کی ساری پریشانیاں نہیں بتاتی تھی۔ اکثر چھپاتی رہتی تھی۔ میں اسے گھر کی آگ سے دور رکھنا چاہتی تھی۔

ایک خوبصورت، پیاری، ہوشیار، محنتی لڑکی نہ جانے کون سے پچھلے جنم میں کیے ہوئے کرموں کی سزا پا رہی تھی۔ میں اُس کے دکھ میں شامل ہوکر گھلتی جارہی تھی۔

میرا بیٹا ساگر، اب اس کار حادثے کے بعد اپنی بیوی سے الگ ہوکر اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ نیا مکان قسطیں نہ بھرنے کی وجہ سے بینک نے چھین لیا تھا۔ اب وہ ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا ہے۔

شراب کے نشے میں دُھت اُس کے پتا اس دُکھ کے پہاڑ کے نیچے دھنس گئے۔

خیر، اوپر والے کو ہی پتہ اُس نے کیا مقدر کر رکھا ہے۔ وہی ہوا جو اوپر والے کو منظور تھا۔ ایک کے بعد ایک زندگی میں آنے والے حادثوں نے سارے گھر والوں کو تنکا تنکا بکھیر دیا۔ اس نازک وقت میں جب ہمیں ساتھ رہ کر پریشانیوں کو حل کرنا تھا، لیکن ہم سوکھے پتوں کی طرح پیڑ سے الگ ہوکر بکھر سے گئے۔

اب رہ گئی میں جو سب باتوں کو سمجھ رہی تھی۔ لیکن کوئی میری بات سمجھ نہیں پارہا تھا۔ بھیشم پتا کی طرح مہا بھارت کی گھریلو لڑائی دیکھتی اور افسوس کرتی رہ جاتی۔ ہم لوگوں کے بیچ غلط فہمیوں کا پہاڑ سا کھڑا ہوتا جارہا تھا۔

باپ بیٹے کی دماغی، جسمانی بیماریاں، لڑائیاں ایک دوسرے کو مارنا، تناؤ، پڑوسیوں کا ہنسنا، پولیس کا دو تین بار گھر آنا اور کورٹ میں بہو، بیٹے کے طلاق کا کیس، پوتے روہت کی بیماری، گھر کا ماحول زہریلا اور کسیلا بن گیا تھا۔ تناؤ بھرے ماحول سے گھر کا ہر فرد منتشر سا ہو گیا تھا۔

چلو اچھا ہوا دو عورتیں، ایک ننھا سا بچہ اس گھٹن سے نکل گئے۔

میں بہت تھک چکی ہوں۔ شروع سے اب تک پورے گھر کو، اکیلے ہی، ایک پہیے سے چلاتے رہنا، معاشی، دماغی، جسمانی بوجھ ڈھوتے ڈھوتے میں خود ہی نڈھال ہو چکی ہوں۔ تھک کر چکنا چور ہو گئی ہوں۔ اور آج کل تو بغاوت نے مجھے بھی چھو لیا ہے۔

کاش! میں اپنی بہو کی طرح گھر چھوڑ کر، اپنے شوہر اور بیٹے کو چھوڑ کر جا پاؤں؟ کاش! میں بھی اپنی بیٹی کی طرح اپنی من چاہی زندگی جی پاؤں۔

ایک اچھی عورت کا مکھوٹا نوچ کر چل پڑوں ایسے راستے پر جہاں میں بھی آزادی کی چند سانسیں لے سکوں۔ بڑی بھدی آوازیں، چیخنا، کھجنا، دھکا مکی، دونوں باپ بیٹے کے بیچ میں بھیانک جھگڑے کا ہونا اور پھر مجھ پر ہی پورا غصہ اُتارنا۔

دنیا کے رسم و رواج، آدرشوں کی حدوں کو انجانے میں یا جان بوجھ کر، ہوش و حواس میں توڑ دوں۔ سب اپنے کیے کا حساب چکاتے ہیں۔ تو بھگتنے دو اُن کو اپنے کیے کا۔ میں کیوں بھگتوں اُن کے ساتھ رہ کر؟ میں اپنے سہاگ اور ممتا کے فرض کو لے کر کب تک اس گھر میں لگی ہوئی آگ میں جلتی رہوں گی۔ مصیبتوں میں پلتی رہوں گی؟ توڑ دوں سارے رشتوں کو۔ اس پنجرے سے نکل کر کھلے آسمان میں اُڑ کر تازہ ہوا میں جینے کا ارمان پورا کر لوں۔

میں نے سوٹ کیس کپڑوں سے بھرا، کچھ ضروری کاغذات لے لیے، کچھ نقد، کچھ زیورات۔ اور گھر چھوڑنے کی تیاری میں جُٹ گئی۔

دھپاک سے آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا ارے! میرے جوان بیٹے کی وہیل چیئر کھسک گئی اور وہ دھڑام سے گر رہا تھا۔ دوڑی دوڑی بھاگی، اپنی بوڑھی بانہوں اور کانپتے ہاتھوں سے سہارا دے کر اُسے تھام لیا۔ اُسے کندھوں کا سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے سے آتے ہوئے ہانپتے، کانپتے شوہر کو پلنگ پر لٹا دیا۔ پانی پلایا، ممتا بھرے ہاتھوں سے سر کو سہلا کر، میں نے

آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو روک لیا۔ اور رسوئی گھر میں جا کر فریج سے سبزیاں نکال لیں۔ ''بھوک لگی ہوگی دونوں کو'' اچانک ہی میں بڑبڑائی۔'ارے! پھر سے میں محبت و ممتا میں پھنس گئی۔

سوٹ کیس، منہ پھاڑے مجھے دیکھتا رہا۔ شادی کے بعد یہ سوٹ کیس گھر چھوڑنے کے لیے نہ جانے کتنی بار میں نے بھرا تھا۔ لیکن اسے اٹھا کر کبھی بھی اس گھر کو الوداع نہ کہہ پائی تھی۔ اور گھر کی دہلیز (چوکھٹ) کو لانگ نہ سکی تھی۔

سرپھرا
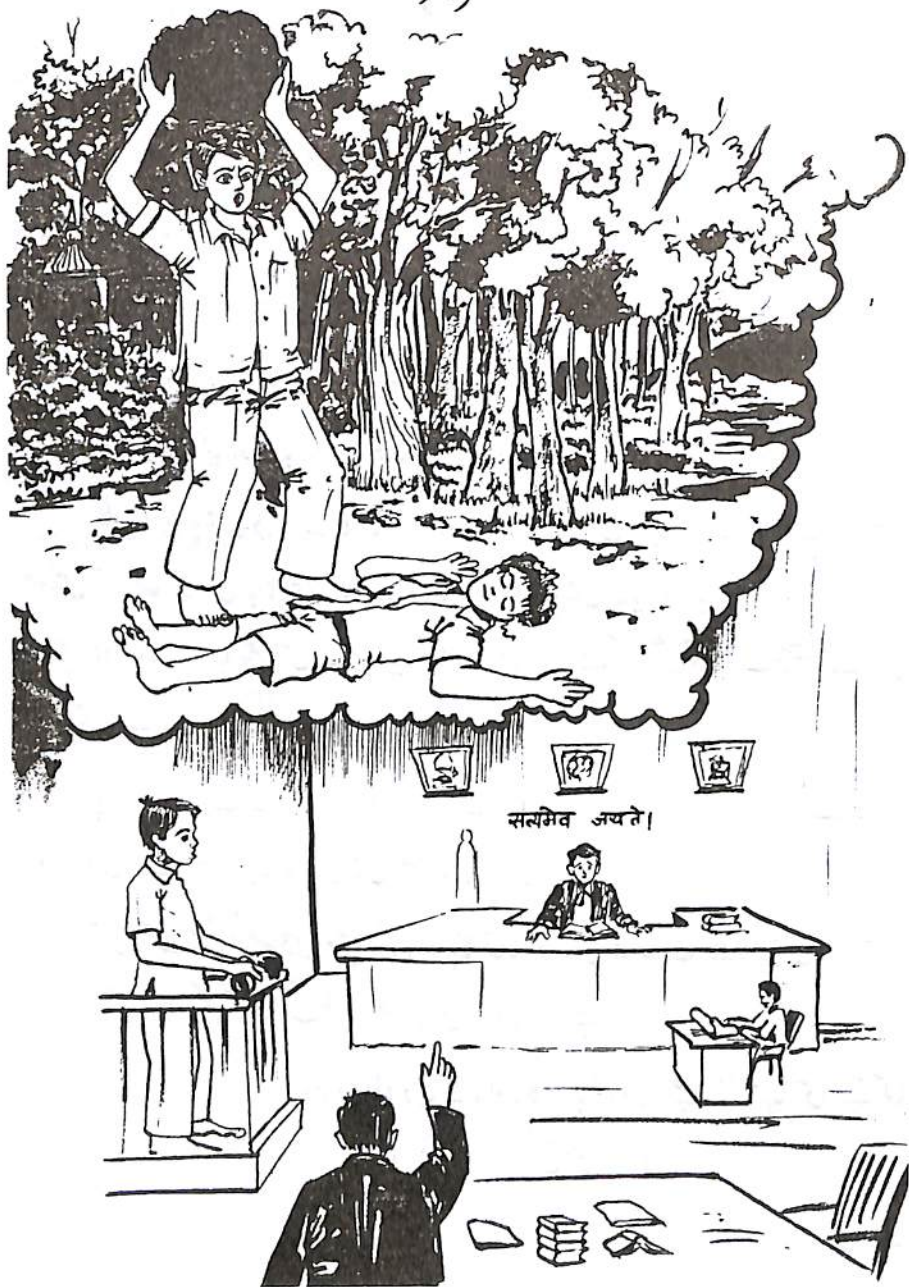
سر پھرا

مندر میں خاموشی طاری تھی دیوتاؤں کو بھی پجاری بابا نے سلا دیا تھا۔ اچانک! وہی جانی پہچانی کپکپاہٹ میرے جسم میں ہونے لگی۔ دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں اور بہت ساری بھیانک ملی جلی آوازیں۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ میں مندر کا دروازہ کھول کر جنگل سے بستیوں کی طرف بھاگنے لگا۔

اور وہی کچھ کیا جو کئی بار کر چکا تھا۔

لیکن آج پولیس کی جیپ کا سائرن سن کر میں پسینے میں ڈوب گیا۔ اور جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہی جانا پہچانا نظارہ۔ خون کے تالاب میں نہایا ہوا ایک چھوٹا سا بچہ۔ خون سے بھرا ہوا ایک بڑا سا پتھر اس کے نزدیک پڑا ہوا تھا اس بچے کی لاش چیتھڑے چیتھڑے ہوگئی تھی۔ میں نے اس بچے کا قتل کر دیا تھا۔

پولیس کی جیپ کے سائرن کی آواز اب نزدیک سے سنائی دینے لگی۔ مجھے رنگے ہاتھوں خون کرتے پکڑا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

آج تک میں ایسے بیس پچیس قتل کر چکا تھا۔ اور آج نہ جانے کیسے پولیس آ دھمکی۔ کافی بھیڑ بھی جمع ہوگئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

''یہ شکل سے کتنا معصوم دکھائی دیتا ہے اور کام جانوروں جیسے۔'' تب کسی نے کہا ''ارے! بچے پر تو زبردستی بھی کی ہے۔ اور پتھر مار مار کر قتل بھی کر دیا۔''

''مار دو اس کو بھی پتھروں سے! گنہگار کہیں کا۔۔۔ اتنا بڑا گناہ۔'' دوسرے شخص نے چلّاتے ہوئے کہا۔

پولیس والوں نے مجھے لوگوں کی مار سے بچانے کیلئے جلدی جلدی جیپ میں ڈھکیل دیا۔

ایک مٹ میلے دانت والے پولیس نے ڈنڈے سے میری ٹانگیں چھوکر پوچھ لیا، ''بچّو ایسا یہ سب خون خرابا، زینہ خوری، کتنی عمر سے کر رہا ہے۔''

میں نے کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ مجھے یاد آنے لگی وہی باتیں، وہی حادثے۔ جب میں سات آٹھ سال کا تھا۔

ماں باپ کا جھگڑنا، پتاجی کا مجھے ماں سے چھین کر الگ کرنا اور کہنا، ''جانکی یہ ہمارے دو جسموں کے گناہ سے پیدا ہوا بچہ ہے۔ یہ ایک گنہگار جسم ہے۔ میں جسمانی تعلقات کو پاپ مانتا ہوں۔ اور یہی میرے گرودیو جی کا حکم ہے۔ میں تم سے جسمانی رشتہ کر بیٹھا، یہ بچہ اسی گناہ کا پھل ہے۔ یہ بچہ گنہگار ہے۔ میں اسے مٹھ میں لے جاکر پاک کروں گا، ورنہ یہ بچہ حیوان بن جائے گا۔ میں اس کا قتل نہیں کروں گا۔

ایک بھیانک آواز کے ساتھ پولیس کی جیپ رک گئی۔ میرے خیالوں کا سلسلہ بکھر گیا۔ جیپ کسی کھڈے سے گزر رہی تھی۔ تبھی ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔

میں عدالت میں کون سا بیان دوں گا، یہ سوچنے میں گم ہو گیا۔

''مت لے جاؤ، میرے بیٹے کو۔ وہ گنہگار نہیں ہے۔'' ماں چلائی تھی۔ میں بھاگ بھاگ کر ماں سے لپٹ رہا تھا لیکن پتاجی نے ماں کی ایک بات نہیں مانی، مجھے ماں سے چھین کر مٹھ میں لے گئے۔

مٹھ میں پتاجی روز مجھ پر دس کوڑے برساتے تھے۔ ''گنہگار'' جسم کہتے تھے۔ پھر ہَوَن، پوجا پاٹ، ورت، اُپواس کرواتے رہتے۔ میں مٹھ میں پلنے لگا۔ میں نفرت، گھٹن، بے چینی، خود پر شرمندگی سے بھرا ہوا بچہ تھا۔

بہت سالوں کی بات ہے۔ ایک رات مجھے مٹھ میں بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتاجی کا

مجھے ماں سے چھیننے والا حادثہ اور گنہگار جسم الفاظ بار بار کانوں میں گونج رہے تھے۔ میں مٹھ سے باہر نکلا، گہرا اندھیرا تھا۔ کچھ جھونپڑیاں تھیں، وہاں میں نے ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا۔ میرا جسم نہ جانے کیوں کانپنے لگا۔

ایک کتا آیا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ میں پیڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ کتا بھونک بھونک کر کہیں چلا گیا۔

میرا جسم کانپ رہا تھا۔ کمر کے نچلے بھاگ میں کچھ ہونے لگا۔ میں اس بچے کو گھسیٹ کر پیڑ کے پیچھے لے گیا۔ وہ بچہ چلانے لگا۔ چھٹپٹانے لگا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ زبردستی کی۔ پھر اس چلاتے روتے بلکتے لڑکے پر پتھروں سے حملہ کرتا رہا۔ گنہگار جسم مر مر کہتا رہا۔ اور بھاگتا چھپتا چھپتا واپس مٹھ میں آ کر سو گیا۔ اس رات میرا جسم اور دل دونوں خاموش ہوئے۔ میں گہری نیند میں سو گیا۔ وہ میرا پہلا قتل تھا۔

اب جیسے یہ سلسلے چل نکلا۔ مارے ہاتھوں یہ بار بار ہونے لگا۔ گہری نیند کی تمنا، تن من کو خاموش کرنے کی بھوک اور اس کے لیے میں قتل کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اور بعد میں میں پھر مٹھ آجاتا۔ گہری نیند سوتا۔ اکثر پوجا پاٹ، بھجن کیرتن میں حصہ لیتا۔ معصوم، بھولا چہرہ، دل میں طمانیت کے جذبات۔ بچے کے جسم کو خراب کر کے اس بچے کا قتل کر کے میں اسے گناہ سے آزاد کر رہا ہوں۔

''اس بچے کا قتل ثواب کا کام ہے۔ گنہگار جسم سے آزادی پا کر وہ جنتی ہو گیا۔ چھوٹ گیا وہ جہنمی جسم سے۔'' میں نے یہ جملہ خاموشی سے دل میں نہ کہہ کر زور زور سے کہا۔

بیان دینے کے بارے میں میں اور سوچ ہی رہا تھا کہ میرا جملہ سن کر پولیس والے نے پاؤں پر زور سے ڈنڈا جماتے ہوئے کہا، ''نالائق کتنے گندے خیالات ہیں تیرے؟ نیچ، تجھے پھانسی پر چڑھا کر بھی یہ سزا کم نہ ہوگی۔۔۔! جیسی حالت تو نے ان معصوم بچوں کی کی ہے ویسی

ہی پتھر مار مار کر تجھے تل تل مارنا چاہیے۔'' اس نے مجھے دو چار ڈنڈے رسید کیے۔

دوسرے پولیس والے نے اسے روکتے ہوئے کہا '' ارے ! چھوڑ دو یہ مر نہ جائے۔ ورنہ تمھیں سزا ملے گی۔ قانون تو اسے چھوڑے گا ہی نہیں۔'' اس پولیس والے نے بھی پانچ چھ گالیاں دے دی اور چپ ہو گیا۔

جیپ تھانے تک پہنچ گئی۔۔۔! مجھے لاک اَپ میں بند کر دیا گیا۔

تھانے میں مار پیٹ کر اور طرح طرح کی جان لیوا تکلیفوں سے انھوں نے مجھ سے آخر پورا سچ اُگلوا ہی لیا۔ میں نے اس طرح کے بیس پچّیس بچوں کے خوفناک قتل کر دیے تھے۔ ان قتلوں کے بارے میں بتاتے بتاتے میں ہی کانپ اُٹھا اور اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرنے لگا۔

اپنے بچے کی کرتوت گاؤں والوں سے سن کر پتاجی تو آگ بگولہ ہو گئے۔ ایک خیال اُپجا کہ ''مارنے دو اتنے گندے گنہگار لڑکے کو، میں تو اسے سدھارنے کے لیے مٹھ میں لایا تھا! ہے پربھو! اس لڑکے نے کیا کیا کر ڈالا!'' وہ بھگوان کے آگے رونے لگا۔ پھر اس پر غصہ، رحم اور ممتا چھا گئی۔ موہ نے اسے گھیر لیا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

میرے پچھڑے خیالوں سے میرا لڑکا دوسرے بچوں کے جسم کو گنہگار سمجھنے لگا۔ غلطی میری اپنی بھی تو ہے؟ میرا لڑکا ایسا بنے یہ تو میں نہیں چاہتا تھا۔ کیا کروں؟ بچے کو تو پھانسی کے پھندے سے بچالوں۔ یہ سوچ کر پتاجی نے میرے بچاؤ کے لیے ایک بہت ہی مشہور وکیل مقرر کیا۔

پتاجی جیل میں ایک دو بار کچھ منٹوں کے لیے اجازت پا کر مجھ سے ملتے۔ وہ بھروسہ دلا کر ہمت بندھاتے رہے۔ لیکن انھیں کیا پتہ کہ جیل میں کیا کیا طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ میں نے تو سب سچ اُگل دیا۔ پتاجی کو بھی بتا دیا۔

پتاجی نے کہا" سارا دوش گھر والوں اور بچپن پر ڈال دو۔"

کافی عرصے کے بعد آخر کورٹ میں حاضر وکیلوں کی جرح کے بیچ مجھے کھڑا کیا گیا۔

اب عدالت میں اپنے بارے میں جرح و بحث سن کر مجھے اپنے بچپن کی بھیانک یادیں، ماں باپ کے بیچ میں گردش کرتی دلیلیں اور بھی تیزی سے یاد آنے لگیں۔

جس بات کو پولیس سے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد سوچتا سمجھتا آرہا تھا وہی پتاجی اور وکیلِ دفاع سے کہی۔ جب مجھ سے عدالت میں بیان لیا گیا میں نے عدالت میں کہا "میرے پتاجی سر پھرے دماغ والے تھے۔ سنکی تھے ان کا یہ کہنا تھا، جسمانی ملن گناہ ہے، اس ملن سے جو جسم پیدا ہوتا ہے یعنی بچہ، وہ بھی گنہگار ہے۔ ہون، پاٹ، منتر، جاپ سے وہ گنہگار جسم پویتر ہونے لگتا ہے۔ صاف بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی گنہگار اور مجھے گنہگار جسم مان کر ماں سے چھین لائے۔"

مجھے بولتے بولتے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ مجھے پانی پلایا گیا۔ میں نے کورٹ میں بیٹھے سارے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ نفرت، اَہنسا اور مجھے کچا کھا جانے کا ارادہ اُن کے چہروں پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وکیلِ دفاع نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا "ہاں۔۔ ہاں۔۔۔ اپنا بیان جاری رکھو۔"

"اُف ! میری ماں مجھ سے بچھڑ گئی۔ اور بددماغ باپ کی باتیں سن کر گھر چھوڑ دیا۔ وہ اس صدمے سے پاگل ہوگئی۔ راستوں پر بھٹک بھٹک کر کار سے کچل کر مر گئی۔

میرے پتاجی اپنے جیسے خیالوں والے لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور مجھے بھی اسی دنیا میں پالنے لگے۔ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسموں سے نفرت کرنے لگا۔" میں نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

سرکاری وکیل نے سوال پوچھا۔''تم نے اپنا پہلا گناہ کیا سوچ کر کیا؟''

میں نے دوبارہ اپنا بیان عدالت میں دیا۔ جب میرا دماغ بچپن کو یاد کرتا۔۔۔ میں غصّے سے بھرا رات کے اندھیرے میں نکل جاتا۔ کسی چھوٹے بچے کو اکیلا پاتا تو جسمانی ملن کر کے گنہگار بنا کر مار ڈالتا اور سمجھ لیتا کہ میں نے اس گنہگار جسم کو نجات دلا دی۔

وکیلِ دفاع نے کہا''یہ لڑکا ماں باپ کے اختلافات اور آپسی جھگڑوں کا شکار بن کر سنکی، بھیانک سر پھرا ہو گیا ہے۔ اسے کم سے کم سزا دی جائے۔

سرکاری وکیل نے کہا''نہیں جج صاحب، اس نے جو بھیانک قتل کیے ہیں اس کو پھانسی کی سزا تو ضرور ملنی چاہیے۔ پھانسی کی سزا بھی اس کے لیے کم ہے۔''

عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے کہا''اسے لوگوں کے حوالے کر دو تا کہ پتھر مار مار کر اسے ختم کر دیا جائے۔''

جج نے ہتھوڑا مار کر آرڈر۔ آرڈر کہتے ہوئے سب کو خاموش ہونے کا حکم دیا اور کورٹ کو برخواست کر دیا۔

اخباروں، ٹی وی اور لوگوں کی زبانوں پر بس میرا ہی چرچا تھا۔ مجھے پاگل، سنکی، راکشس اور حیوان کہا جانے لگا۔ کہیں تو کوئی بچارا بھی کہہ دیتا''ماں باپ کے جھگڑوں کا شکار، باپ کے پاگل پن کا نتیجہ۔''

کسی نے ٹی وی پر کہا،''اس کا سر منڈوا کر، منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر، کوڑے مار مار کر مروا دو۔ جیسے پہلے زمانے میں راجا انصاف کرتے تھے۔''

کوئی کہہ اٹھا''ہاتھ پیر کٹوا کے سوکھے کنویں میں ڈال دو سانپ بچھوؤں کے بیچ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

چار پانچ دنوں کے بعد پھر سے عدالت میں کیس کی شنوائی شروع ہو گئی۔

وکیلوں کی طرح طرح کی جرح و بحث کے ساتھ ہی قانون کے باریک نقطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عدالت نے مجھے خطرناک پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں رکھنے کا حکم دے دیا۔

دنیا کی عدالت نے مجھے جو بھی سزا دی ۔۔۔لیکن اپنے ضمیر کی عدالت میں میں پھانسی کے لائق ہوں، ایسا مجھے محسوس ہونے لگا۔

میں نے جج صاحب کے نام ایک چٹھی لکھی اور چوری چھپے منگایا ہوا زہر کھا لیا۔

''جج صاحب میں آخری سانسیں لیتے ہوئے اپنا بیان آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں سرپھرا تو ہوں ہی۔ میرے پتا جی کو بھی سنکی مانا گیا۔ میرے پتا جی کو یقین تھا جو غلط تھا لیکن انھوں نے مجھے بھرشٹ کر کے مار نہیں ڈالا تھا۔ میرا قتل نہیں کیا۔ مجھے الگ ماحول میں پالا پوسا۔ میں نے گنہگار کی طرح قتل کیے ہیں۔ میں بالکل غلط ہوں۔ ساری باتیں میں نے غلط سمجھی ہیں اور ماں باپ پر اپنے گناہوں کا الزام ڈال کر میں اور گنہگار نہیں بننا چاہوں گا۔''

اپنے ہاتھ سے لکھی اس چٹھی میں میں نے اپنے ضمیر، اپنی روح کا بیان لکھ دیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سزا دے دی ہے جو میرے گناہوں سے بہت کم ہے۔!

دو مائیں

دو مائیں

ایروڑہ جیل میں وارڈن ہونے کے دوران بہت ساری عورتوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں، ان کی باتیں بھی۔

پاروتی۔۔۔شوہر کا خون کر دیا، عمر قید کی سزا، ماتھے پر بڑا سا تلک، چہرے پر روشنی، چکی پیسنا، سارے مشکل کام کرنا، کسی بھی شکل میں خونی، خوفناک، ڈراونی نہیں لگتی تھی۔ میں ان دنوں چھوٹی عمر کی ہی تھی۔ پاروتی دیدی کا مایوس خاموش چہرہ، ان کا رہن سہن، سوچ مجھے بہت ہی متاثر کرتی، میں اکثر ان کے آس پاس منڈلاتی رہتی، ایک خونی جس نے اپنے شوہر کا خون کر دیا وہ ڈراؤنی، خوفناک اور پاگل پن و دہشت سے بھری ہوئی کیوں نہیں لگتی؟ اس راز کی حقیقت جاننے کے شوق کی وجہ سے میں ان کی طرف کھینچتی چلی گئی۔

میں زیادہ سے زیادہ انھیں چاہتی تھی۔ بچپن سے ہی ایک عادت پڑ گئی تھی مجھ میں۔ میں اپنے کرداروں کے اِرد گرد منڈلاتی رہتی ہوں۔ جب میں پوری طرح سے جان نہ لوں اور پھر لکھ نہ دوں، چین نہیں آتا مجھے۔۔۔ اکثر میں زیادہ سے زیادہ اپنے کرداروں سے ملتی رہتی ہوں۔ یہ بات بغیر سوچے ہوتی ہے یا جان بوجھ کر، جانے انجانے؟ ہر وقت ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ۔

میں پاروتی دیدی کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھی۔ اور خاتون قیدیوں کے سامنے اُن کا معصوم سا چہرہ دیکھ کر اور بے گناہی سے بھرا ہوا چہرہ سانولا سانولا سا روپ، بڑی بڑی معصوم آنکھیں کھینچ لیتی تھیں مجھے۔

دیدی نے چکّی پیس کر دس کلو اناج پیس لیا تھا۔ چکّی کی رے رے کی آواز ماحول کو

پس منظر دے رہی تھی۔ میں آگے بڑھی، پسیے ہوئے آٹے کو ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے پوچھ ڈالا، دیدی! آپ سے قتل کیسے ہوگیا؟ جھوٹا الزام کیسے لگا؟ کس نے لگایا؟ یہ فریب آپ سے کس نے کیا؟ ساڑی کے پلّو سے پسینہ پوچھتے ہوئے پاروتی دیدی نے کہا،'' الزام؟ نہیں'' میم صاحب یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔

میں وارڈن تھی۔ تو اس حساب سے چھوٹی عمر میں بھی اسٹاف اور قیدیوں کی نظر میں میم صاحب ہی پکاری جاتی تھی۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے بیچ میں ہی کہا، مجھے میم صاحب نہیں، مجھے میرے نام سے ہی پکار سکتی ہو پاروتی دیدی، اس نے میرے نام سے پکارتے ہوئے کہا ''یہ سچ ہے میں نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔''

اس کی آواز میں ذرا بھی کپکپاہٹ اور پچھتاوا نہیں تھا۔

میں نے حیران ہوکر کہا ''کیا آپ نے اپنے ہوش حواس میں شوہر کا خون کیا تھا؟''

''ہاں!''

اتنے میں کھانے کا سائرن بجا۔ میں اور پارو دیدی چونک کر اٹھ گئی۔ کھانے کی بڑی لمبی قطار لگتی تھی۔ پھر کھانے پروسنے کی تعداد دھیرے دھیرے کم ہوجاتی تھی۔ اس لیے ساری قیدی عورتیں لگ بھگ دوڑ کر جلدی ہی قطار میں شامل ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ تو پارو دیدی، قطار میں شامل ہوگئی، میں اپنی آفس میں کھانا کھانے چلی گئی۔

ہمیں ۔۔۔ چیخنے لڑنے کی آوازوں نے چونکا دیا۔ دو خاتون کانسٹبل ایک لڑکی کو پکڑ کے لا رہی تھیں۔ وہ لڑکی گیہوں رنگ کی، درمیانہ قد، وحشت اور دہشت سے بھری آنکھیں، منہ سے تھوڑا سا جھاگ بہہ رہا تھا۔ زوردار آواز میں چیخ رہی تھی،'' مار ڈالوں گی، میں سب کو مار ڈالوں گی'' وہ خاتون کانسٹبل سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کی ہری سلک کی ساڑی کا پلّو بار بار کندھے سے پھسل کے دھول میں اَٹا جا رہا

تھا۔ بلاؤز کے ایک دو ہُک ٹوٹے سے تھے۔ گلے اور چھاتی کے حصے جو دکھائی دے رہے تھے اس پر ناخنوں کے نشان بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

ایک عورت کانسٹبل نے کیس پیپر میرے آگے بڑھا دیا۔ میں نے پہلے جرم والا کالم پڑھ لیا۔ ماں کا خون کرنے کے الزام میں گرفتار ۔۔ میں چونک گئی، کانپ بھی اٹھی، پھر اپنے آپ کو کچھ سیکنڈ میں متوازن کر کے میں نے اسپتال میں ڈاکٹر کو فون کیا، قیدی دماغی اور جسمانی طور سے بہت نڈھال ہے، آپ دو دنوں کے لیے اسے آرام دیں اور پیٹ بھر کھانا کھلائیں۔ اسے اسپتال میں پولیس کی کڑی نگرانی میں رکھیں۔

میں نے ایروڑہ جیل کی ''عورت سینٹر'' سے بھی بات چیت کر لی۔ کچھ عرصے میں سب کارروائی ہو گئی۔ جیل میں خاموشی تھی، تھوڑا وقت آرام کا تھا۔ میری نظر آدھے کھلے ٹفن پر گئی۔ بھوک کا احساس جاگا، کھانا کھانے بیٹھ گئی۔

جیل میں شام ساڑھے سات تک میں عورت قیدیوں کی کیس ہسٹری پڑھتی رہی۔ پھر اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ وارڈن ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنے گھر والوں سے اجازت نہیں ملی تھی کہ میں جیل سے ملے ہوئے اپنے کوارٹر میں رہوں۔ جیل والے چاہتے تھے کہ میں وہاں پر ہی رہوں، ان دنوں گھر والے اس بات کو گلے نہیں اُتار پائے کہ لڑکی اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور رہے۔ وہ تو سخت ناراض تھے میں نے ایسی نوکری کیوں اپنائی جہاں گناہوں سے بھری عورتیں تھیں، جو قتل کرتی ہیں، جو چور ڈکیت وغیرہ ہیں۔ ماں کہتی تھی ان کی سنگت کا اثر مجھ پر پڑ جائے گا۔ گھر جانے میں تھوڑی بھی دیر ہو جاتی بار بار ماں یا بھابھی کے فون آنے لگتے، کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ ایروڑہ جیل کی مہیلا وبھاگ کی وارڈن ہونا اس وقت میرے لیے ایک چنوتی سی تھی۔ میرے گھریلو ماحول کے حساب سے!

اکثر بڑے بھیا سر پر ہلکی چپت لگا کر کہتے، ''سر پھری لڑکی۔''

گھر آ کر دیا، بتی جلایا۔ اگربتی کی خوشبو سے گھر کا ماحول پاکیزہ ہو گیا۔ آرتی شروع کی ماں، بھابھی، بھیا بھی آرتی میں شامل ہو گئے۔ من کے آئینے پر اُبھرے سارے حادثات ڈھل گئے۔ گھر والوں کے ساتھ کھانا کھا کر ماں سے لپٹ کر میں بے فکر نیند میں سو گئی۔

صبح پھر وہی میں، وہی جیل کی دیواریں، خاتون قیدیوں کی نفسیات کی ماہر ہونے کی وجہ سے میں نے یہ نوکری اپنائی تھی۔ کسی بدحواس پل میں خون کرنے والی عورتیں کچھ ناانصافی نہ سہنے والی عورتیں، کچھ بالکل چپ چاپ، کچھ گھر جا کر اپنے بچوں سے ملنے کو بے چین، کسی کو گھر جانے کی کوئی چاہت نہیں۔ اپنی کرنی کو کوستی ہوئی، کوئی روتی، بلکتی، سسکتی عورتیں۔ سب عورتوں کے چہرے، قد، گھریلو ماحول، فوٹو کے ساتھ میرے کیس ہسٹری فائل میں بند تھے۔

آفس کے ضروری کام نپٹا کر میں راؤنڈ کے لیے چل پڑی جو میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ پاروتی دیدی کے پاس پہنچی ماتھے پر بڑا سا ٹیکا صاف ستھری دھلی سفید ساڑی جس پر نیلے رنگ کی بارڈر تھی۔ پہنے وہ چرخی کات رہی تھی، پوری طرح لین ہو کر میرے کھنکھارنے سے گردن اوپر کر کے میری اور دیکھا، میں اس کے پاس بیٹھ گئی کسی مندر میں بیٹھنے جیسا سکون حاصل ہوا۔ پاروتی دیدی آپ نے اپنے شوہر کا خون کیوں کیا؟ اور آپ کو اس بات کا پچھتاوا کیوں نہیں؟ کام کرنے والے اُس کے ہاتھ کو میرے سوال نے روک لیا۔

''سننا ہی چاہتی ہو میڈم تو سن لو! لیکن میں اس کی وجہ صرف تمھیں ہی بتاتی ہوں، جو کورٹ میں نہیں بتایا، کسی وکیل کو بھی نہیں بتایا۔

واسنا کا ایک کیڑا میرا شوہر، سمجھ لو کہ ایک وحشی بھیڑیا ہی تھا۔ جس کی صرف مجھ سے ہی جسمانی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ یہ بات دھیرے دھیرے شادی کے پانچ سال کے اندر میں جان پائی۔

اچھا خاصا کماتے تھے۔ ساس، سسر، نند، دیور سب بھلے تھے۔ میں نے سوچا چلو ان

میں ایک بُری عادت ہے۔ شاید میرے پیار، بھروسے سے دور ہو ہی جائے گی۔ میں پانچ سالوں میں دو بچوں کی ماں بن گئی۔ لڑکی بڑی تھی، جانکی اور لڑکا کسن ۔۔۔

بیچ بیچ میں میرے شوہر کی وحشی حرکتیں میرے کانوں پر پڑتی رہتی تھیں۔ ایک بار تو جب میں گھر میں اکیلی تھی، ایک عورت کے ساتھ آیا تھا، باورچی خانہ کی کڑی لگا دی۔ میں اندر ہی رہی۔ بعد میں میں جھگڑتی رہی روتی رہی۔ بچے بڑے ہوتے رہے، میں نے پورا دھیان بچوں کی پرورش اور پڑھائی پر ہی دیا تھا۔

یہ اس دن کی بات ہے۔ ساس، سسر یاترا پر گئے ہوئے تھے۔ کسن اپنے کاکا کے پاس گیا تھا۔ میں اپنے ممیرے بھائی کے لڑکے کی نام رکھائی سے لوٹی تھی۔ گھر سے زور زور سے چلانے کی، ٹوٹنے، پھوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دروازہ بند تھا، لیکن پرانا تھا اور کڑی کمزور تھی۔ کرسی سے زور سے مارنے سے دروازہ کھل گیا۔ میرا شوہر، جانکی کا باپ، اپنی بیٹی سے زبردستی کر رہا تھا۔ جانکی چلاّ رہی تھی 'ماں، ماں بچاؤ' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاس میں رکھے ہوئے گنڈھاسا سے واسنا کے اس کیڑے کو مار ڈالا۔ جانکی کو جلدی سے کپڑے پہنا دیے، گلے لگایا، خاموش کیا اور کہا کسی سے بھی اس حادثے کے بارے میں نہ کہے۔ میں اس کی شادی کسی بھلے لڑکے سے جلد سے جلد کروا دوں گی۔ کورٹ میں بیان دیا،" آپس میں جھگڑا ہوا، میں نے اپنے شوہر کو مار ڈالا۔"

پارو دیدی دھیرج کھو چکی تھی۔ میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ مٹکے میں سے پانی کا گلاس بھر کر میں نے اسے پلایا اور تھپتھپایا، سہلایا اسے سلایا اور کہا اب آرام کر لو دیدی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھمایا، میں نے کھولا اس میں اس کی بیٹی، شوہر اور بچے کا فوٹو تھا اور خط جس میں یہ لکھا تھا، ماں، میرے جیسی اپنے ہی باپ کی وحشت کا شکار بنی ہوئی لڑکی کی خالہ نے پڑھے لکھے لڑکے سے شادی کروا

دی۔ اور کسن کی پڑھائی بھی تمھارے روپے بھیجتے رہنے سے ہی چل رہی ہے۔ اور تمھارے لیے ہماری عقیدت بڑھتی جارہی ہے۔

کسی کے قدموں کی آہٹ نے میرا دھیان توڑ دیا۔ میں نے دیکھا سفید شرٹ پینٹ، کالے چمچماتے جوتے پہنے ہوئے ایک وارڈ بوائے گنگیا، جس کا پورا نام گنگا رام تھا، سانولا رنگ، قد اونچا، مونچھیں بڑی بڑی، آنکھیں بھُرے رنگ کی، اس کے دانت اور مسوڑھوں کا کچھ حصہ اور ہونٹ کالے تھے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا، وہ ہم سے چھپکے تمبا کو کھاتا ہوگا۔ وہ میرے پاس جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا آ پہنچا اور کہنے لگا وہ لڑکی اب ٹھیک ہے۔ میم صاحب، مہیلا پولیس آپ کو بلانا چاہتی ہے۔ میں اس اور لپک لی۔

وہ لڑکی ہوش میں آ گئی تھی۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر بس یوں ہی گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، کیسی طبیعت ہے؟ ''ٹھیک ہوں۔'' نام کیا ہے؟ مالتی ہوں۔ پھر میں نے دو پولیس عورتوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''آپ لوگ باہر جا کر کھڑی رہیں،'' میں نے مالتی کی کلائیوں کو سہلایا، ٹیبل پر رکھی ہوئی مرہم لگائی۔ گلوکوز کی نلیوں سے کلائی کی نسیں پھول گئی تھیں۔ ہاتھوں کا سہارا دے کر اسے بٹھا دیا اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اسے دھیرے دھیرے پلانے لگی۔

دودھ پیتے پیتے اچانک وہ سسکنے لگی، ''دیدی میں ویسی نہیں ہوں۔ میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا،'' کیسی؟'' ''خونی، خوفناک، سب کا خون کرنے والی وغیرہ وغیرہ۔ دیدی میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں آپ سمجھ رہی ہیں؟''

''ہاں! پھر اپنی ماں کا خون کیوں کر دیا؟ کیا یہ تم پر جھوٹا الزام ہے؟''

''نہیں، میں نے اسے مار ڈالا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں مار ڈالا؟ کیا تم مجھے بتاؤ گی؟''

''دیدی، میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اسکول میں ہمیشہ پہلا نمبر آتا تھا۔ مجھے پڑھ لکھ کر ٹیچر بننا تھا۔ ایک پڑھا لکھا نوکری والا شوہر اور چھوٹے چھوٹے پیارے بچے۔ ایسا مقصد تھا میری زندگی کا۔ میرے پتا جی کا بھی یہی سپنا تھا'' اس نے کہا۔

''تمھارا مقصد تو بہت اچھا تھا بٹیا۔'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا ہوگیا؟''

''والد کے گزر جانے کے بعد ماں کا رہن سہن اور اخلاق بدلنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں؟'' اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''اس دن میں اپنے کمرے میں امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ دو لوگ میرے کمرے میں گھس آئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں نے اُن کا اِرادہ بھاپ لیا۔ ٹیبل لیمپ سے حملہ کیا اور جو چیز ہاتھ لگتی گئی، میں پھینکتی گئی۔ لیکن کچھ دیر کی لڑائی کے بعد وہ دونوں مجھ پر حاوی ہو گئے۔ میرے جسم اور دل کو روند دیا۔ میں زنا کا شکار ہوگئی اور دماغی تناؤ کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی۔'' اس نے ہانپتے ہانپتے سنایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے تجسّس بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے ڈری سہمی آواز میں جواب دیا، ''جب آنکھ کھلی تو کھلا ہوا دروازہ اور کمرے میں اندھیرا دیکھا۔ یوں ہی لنگڑتی لنگڑتی میں دروازے کے پاس آئی۔ آواز سن کر تھم گئی۔ پہچانی سی آواز تھی۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔''

اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے اس کو پانی پلایا اور پیٹھ سہلانے لگی۔

''ہاں! ان دونوں میں سے وہ ایک تھا۔ جس نے میری روح اور جسم کو داغدار کر دیا تھا۔ اس نے بٹوے میں سے ڈھیر سارے نوٹ میری ماں کی ہتھیلی پر تھماتے ہوئے کہا، ''مزہ آ گیا آنٹی۔'' اور میری ماں نے ہنستے ہنستے وہ سارے نوٹ لے لیے اور کہا، ''جب ضرورت پڑے تو

نوٹ لے آنا،'' اس وقت میری ماں چھری سے سبزی کاٹ رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔

''میں اپنے کمرے سے اسی بکھری ہوئی حالت میں بھاگی، چھری ماں کے ہاتھ سے چھین کر بس اس کے پیٹ میں گھساتی چلی گئی۔ اور اس کی کوکھ کو چھلنی چھلنی کر دیا اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر پولیس تھانہ، کورٹ اور اب جیل میں۔'' میں نے مالتی کو آرام دینے کے مقصد سے پانی پلایا اور اسے سہلایا۔

''مجھے ذرا بھی افسوس نہیں جو کچھ میں نے کیا۔'' وہ تھک گئی تھی۔ اس نے اشارے سے کہا۔ میں نے اسے لٹانے میں مدد کی۔ کمبل اڑھایا اور اس کو تکتی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی ملال یا پچھتاوا نہ تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ خاموشی تھی۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ہر انسان اپنے آپ میں ہی ایک الگ سنسار لیے ہوتا ہے۔ الگ اخلاق، تہذیب، مزاج، اصول لے کر جیتا مرتا ہے۔ ہم مداخلت کرنے والے کون ہیں۔

ایک ماں نے اپنی بیٹی کی آبرو لوٹنے کی کوشش کرنے والے اپنے شوہر کا خون کر دیا اور چُپ چاپ خاموشی اختیار کر کے جیل کی سزا کاٹ رہی ہے۔

دوسری ماں نے چند روپیوں کے لیے اپنی بیٹی کی آبرو کا سودا کیا اور اس بیٹی نے اس ماں کا خون کر دیا۔ اور اب وہ بنا پچھتاوے کے عمر قید کی سزا بھوگ رہی ہے۔ بڑی حیرت ہوئی تھی رشتوں اور سزاؤں کو دیکھ کر۔

سب اپنے اپنے ضمیر سے اپنے اپنے فیصلے لیتے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں بیچ میں آنے والے؟ دو ماؤں نے اپنی بیٹیوں کے لیے الگ الگ فیصلے کیے۔

جا تو میرے لیے مر گئی

جا تو میرے لیے مرگئی

ایک ننھے بچے کی طرح ہر چیز مجھے دلچسپ، خوبصورت پیاری سی لگتی ہے۔ آسمان، بادل، بارش، پھول، چوڑیاں، رنگ برنگی کپڑے، لوگ، مختلف لباس، کھانا پینا، سہیلیاں، سترہ سال کی عمر میں مجھے بھرپور جینے کی چاہ ہے۔

آج کل میں ممبئی ہی میں رہتی ہوں اور ایک گھر میں نوکرانی کا کام کاج کرتی ہوں، میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئی ہوئی لڑکی ہوں۔ ہمارا چھوٹا سا گاؤں، باپ دادا کھیتی کرنے والے کسان۔ کوئی زمانہ تھا سب کا گزارا کھیتی پر ہی ہوجاتا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے مدرسے میں ساتویں آٹھویں پڑھ کر کام پر یعنی کھیتی باڑی میں سب جٹ کر کام کرتے، پیٹ پال لیتے تھے۔

دھیرے دھیرے لوگ شہر میں روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری چیزیں پانے کی خواہش میں بھاگنے لگے۔۔۔!

شہر کی رنگینیاں، رنگین کپڑے، سجاوٹیں، اسکوٹر، کاریں، ٹی وی، چیزیں، ڈرامہ، سنیما، کھلے عام لڑکے لڑکیوں کا گھومنا، سگریٹ پھونکنا، ہوٹلوں میں بیٹھنا۔ کتنا خوبصورت ماحول ہوتا ہے۔ جتنی رات بڑھے اتنا شہر اور رنگین ہوتا جاتا ہے۔ گاؤں چھ سات بجے ہی اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔

نہ بڑے نہ رنگین جھلملاتے راستے، بھیانک سناٹا، کھانستے میلے کپڑے پہنے ہوئے غریب کسان، گندگی اور بدبو سے بھری جھونپڑیاں، ٹمٹماتی لالٹینیں، اناج کی کمی کے سبب منہ پھاڑے ہوئے، راکھ لکڑیوں سے بھرا ہوا چولہا جو کبھی جلایا جاتا کبھی نہیں۔

بارش میں ہمیں سوکھی لکڑیاں بھی مل نہیں پاتیں۔ ماں باپ کی لات گھوسے کھا کر بھی ہماری نہ بھوک مٹتی، نہ سبزیاں نہ دو روٹیاں، یا چاول۔ ہم پیٹ بھر کھانے کو ترس جاتے۔ کنویں سے کھینچ کر نکالا ہوا یا کسی تالاب سے بھرا ہوا مٹ میلا پانی ہی ہمارے لیے غنیمت تھا۔

مالکن نے پانی مانگا! میری سوچ ٹوٹی۔۔۔ بھاگتے بھاگتے صاف ستھرے فریج سے صاف ستھری پانی کی بوتلوں سے پانی نکال کر کانچ کے جگمگاتے گلاسوں میں بھر کر ٹرے میں رکھ کر بڑے ہی احتیاطی سے میں لے آئی۔

مالکن اور ان کی چار پانچ سہیلیاں تاش کھیلنے میں مگن تھیں۔ ایک سہیلی نے مجھے مذاق کا نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کیا گنگو۔۔۔ آج کل گجرے وجرے لگائے بیٹھی ہو۔ کہیں کوئی دوست وغیرہ کا چکر تو نہیں۔۔'' سب ہی۔۔۔ ہی کر کے ہنسنے لگیں، سب کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔۔۔! میرے دل میں بھدی سی گالی ابھری، ہونٹوں تک نہیں آئی۔

میں بھی ہی۔۔۔ ہی کر کے ہنسنے لگی۔ دوسری نے پھر میرا ہی مذاق اڑاتے کہا، ''گنگو تیرے دانت بہت ہی چمکیلے ہیں۔'' تیسری نے کہا ''کالا جو رنگ ہے، اندھیرے میں بھی کھڑی رہی تو صرف دانت ہی دکھائی دیں گے۔۔۔'' پھر سب نے قہقہہ مارا۔

میں نے دھیرے دھیرے ہاتھ ٹیبل کور کی طرف بڑھائے اور اس کو کھینچ لیا! پانی کے سب گلاس نیچے گر کر چکنا چور ہو گئے۔۔۔! سگریٹ، شراب، مٹن، سبزیاں، پانی، گلاس کے ٹکڑے، تاش کے پتے، کھانے کی پلیٹ سب تہس نہس ہو گئے۔ نیچے سارا ملیدہ، بھیل پوری سا ماحول فرش پر ہو گیا۔

مالکن گرجنے لگی۔ اس کا ہاتھ مجھے مارنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے معصوم بھولی سی صورت بنا کر میڈم سوری کہہ کر۔۔۔ بڑی اداکاری کر ڈالی۔۔۔! ایک سہیلی نے اسے کہا، ''مارو نہیں، میں ایک سماج سیویکا ہوں۔۔۔! اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ سب

نے حامی بھری۔

پھر مالکن بھی سمجھ گئی، ایک نوکرانی تو چھٹی لے گئی ہے۔ اب مارنے سے یہ بھی کہیں بھاگ گئی تو سارا کام کون کرے گا؟

اس نے پینترا بدل دیا اور کڑوی آواز کو میٹھے میں بدل دیا۔

ساری عورتیں اس روم کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگیں۔ مجھے سب کچھ صاف کرنے کو کہہ دیا گیا۔

میں دل ہی دل بہت خوش ہوئی۔۔۔! ان کے رنگ میں بھنگ ڈال کر سب کچھ صاف کر کے کچھ پیٹ میں ٹھونس کر صاف ستھرے پانی کو پی کر میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں زمین پر بچھے ہوئے بستر میں گھس گئی! آس پاس پرانے اناج کے ڈبے، تیل بوریاں ردی کے سامان ''اسٹور روم'' اس کمرے کا نام تھا۔

مجھے یاد آنے لگی، پکیا یعنی پرکاش کا کمرہ صاف ستھرا ایک بنگلے کے پاس چھوٹا سا ریڈیو، ٹی وی، پلنگ، چاروں طرف بغیچہ، ممبئ میں کام کرنے والے رتنا گیری کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے لڑکے لڑکیوں کا رہنے کا آسرا اس کا کمرہ ہی تھا۔ خاص کر کے بیماری کی حالت میں اس گاؤں کے لڑکے لڑکیاں اس کے کمرے میں چار چھ دنوں کے لیے پناہ لیتے تھے۔ ٹھیک ہو کر کام پر چلے جاتے تھے۔

پکیا کا ایک خود کا کمرہ تھا۔ وہ مالی، ڈرائیور، کھانا پکانا، لائٹ کا کام سب کچھ جانتا تھا۔ مہینے میں ایک بار ہم نو دس لڑکے لڑکیاں اس کے یہاں پارٹی کرتے تھے۔ پرکاش کا بنگلے والا مالک بہت رئیس تھا۔ کھانے پینے کا شوقین تھا۔ پکیا کو بہت عیش میں رکھتا تھا۔ پارٹی کے دن پکیا بھی مالک کے سگریٹ، دارو، مٹن، مچھلی چرا کر ہم لوگوں کو دیتا تھا۔

ہم سب لوگ اپنے دکھ سکھ پکیا کو بتاتے رہتے تھے۔ اس سے ہی صلاح کرتے،

ترکیب لیتے۔ مالکوں کے یہاں سے چوری کی ہوئی چیزیں، پیسے اسی کی پرانی کباٹ میں رکھتے تھے۔ جو اس کے مالک نے دے رکھی تھی گودریج کا کباٹ تھا۔ پکیا پرانا سامان کوڑی کے مول مالک سے خرید لیتا تھا۔ اور پگار سے تھوڑا تھوڑا کٹواتا رہتا تھا۔ اگلے مہینے وہ مالک سے پرانا فریج خریدنے والا ہے۔

ممبئ کے گھروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کے لیے پکیا ہیرو سے کم نہ تھا۔ سب کے سپنوں میں بسا ہوا! میرے بھی ۔۔۔۔

دن بھر کے کام کی تھکان سے دھیرے دھیرے نیند حاوی ہونے لگی۔ خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا۔ اور نیند چھانے لگی۔

صبح اٹھتے ہی ضروری کاموں سے فارغ ہوکر میں اپنی روزمرہ میں مصروف ہوگئی۔ دوپہر کو مہاراج جو اس گھر کا رسوئیا تھا، بلانے لگا گنگو تیری بہن کا فون آیا ہے۔

فون اُٹھایا۔ وِلی کا تھا۔ "گنگو، آئی (ماں) بیمار ہے گاؤں میں۔ میری مالکن چھٹی نہیں دے رہی ہے۔ تو اپنی مالکن سے قرض لے کر گاؤں چلی جا۔"

میں نے غصہ کرتے ہوئے کہا، میں گاؤں نہیں جاؤں گی، تمھیں معلوم ہے، مجھے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کا ماحول بالکل اچھا نہیں لگتا۔ چار سال سے ممبئ ہی میرا اپنا سب کچھ ہے۔ یاد ہے پچھلی بار 'ماں' نے مجھے کہا تھا جھگڑے کرتی ہو اب ممبئ مت جاؤ، گاؤں میں ہی کرشنا سے میں تیری شادی کرادوں گی۔ گاؤں میں ہی رہ جا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ میں تب بہت جھگڑی تھی، پھر سے سامان لے کر ممبئ بھاگ آئی۔ ماں نے کہا تھا "آج تو شہر جا لیکن آج سے گنگیا تو میرے لیے مرگئی" میں اب کبھی بھی گاؤں نہیں جاؤں گی، پیسے میں کسی کے ہاتھ سے بھجوادوں گی۔

فون رکھ کر ہال میں جا کر میں نے ٹی وی چالو کر دیا۔ مالکن نے کہہ رکھا تھا۔ اگر کوئی

کام نہ سوجھے تو ایک دو گھنٹہ ٹی وی دیکھ لینا۔ زیادہ وقت نہیں۔

بیچ بیچ میں فون آتے رہے، میں لکھتی رہی۔ کس کس کے فون کس کے نام آئے یہ لکھنا میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔

ہمارے گاؤں کے رشتہ داروں کی مدد سے ہم گاؤں سے آئے نوکروں پر اپنے مالک اور مالکن کی سنگت کا بہت برا اثر پڑ گیا تھا۔ ان لوگوں کے جیسا پہراوا، کھانا پینا، سگریٹ پھونکنا، گالیاں بکنا، غصہ، ٹینشن، جھگڑے، موج مزے، ہم سب لوگ لگ بھگ بگڑ چکے تھے۔ سب کے گھر والوں نے کہہ دیا تھا ''تم لوگ ہمارے لیے مر چکے ہو۔''

میرے دل میں سوال ابھرنے لگتے تھے۔ کہ گاؤں میں بھی تو بہت سارے لوگ تمباکو کھاتے، بڑی پیتے، تاڑی اور شراب پیتے رہتے ہیں۔ گالیاں بکنا، مارنا پیٹنا سب کچھ ویسا ہی تو ہے۔ پھر سبھی لوگ بڑے شہروں کو ہی گالیاں کیوں دیتے ہیں۔ برا بھلا کیوں کہتے ہیں؟ کیا وہاں پر ہم برے نہیں بنتے؟ بھولے ہی رہتے ہیں؟ جیسی سنگت ویسی رنگت۔۔۔ پھر ہم لوگوں کو کیوں وہ لوگ کہتے ہیں ''تم ہمارے لیے مر چکے ہو۔''

دو چار لڑکے لڑکیاں ایسی تھیں جو نہ چوری کرتی نہ جوا نہ شراب، نہ سگریٹ۔ سادھو سنتوں جیسی باتیں کرتے۔ اپنے مالک اور مالکن کی طرح سال میں دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر گاؤں جاتے۔ پیسہ گھر والوں کو دیتے۔ تحفے لے جاتے۔ گھر والوں کی سیوا کر کے دعا لے کر آتے۔ میری بہن بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی۔

میں پچھلی بار دو سال پہلے ماں کے پاس گئی تھی، ماں نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ میں بھی خوش تھی۔ دن بھر اچھا گزرا رات کو میرا سوتیلا باپ نشے میں دھت گھر میں گھسا اور ماں کو گالیاں دینے لگا۔ چھوٹی سی بات تھی سبزی میں مرچی زیادہ پڑ گئی تھی۔ اس نے گرم گرم پتیلی ماں پر پھینکی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، انگاروں بھرا چولہا کپڑے سے اٹھا کر اس پر پھینک دیا۔

آناً فاناً میں باپ کے چیخنے چلانے پر لوگ دوڑے آئے۔ اس کا چہرہ جل گیا تھا، کافی شریر بھی۔ اسپتال میں اسے بھرتی کروا دیا اور دوسرے دن ماں نے کہا ''جا اپنے شہر۔ میرے لیے تو مرگئی۔'' میں نے بھی اسے کہہ دیا غصہ میں ''میرا باپ مرگیا تو نے دوسری شادی کرلی۔ یہ آدمی جو اپنی بیٹی پر بھی بری نظر ڈالتا ہے وہ باپ نہیں ہے۔ جس دن تو شادی کر کے دوسرا باپ لائی تھی اس دن سے تو میرے لیے مرگئی تھی۔''

گھر کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی اور جلدی ہی دروازے پر کوئی زور زور سے تھپتھپانے لگا۔ ٹی وی کی آواز کی وجہ سے کافی دیر سے میں گھنٹی کی آواز سن نہیں پائی تھی۔ ٹی وی بند کر کے میں نے دروازہ کھولا۔ میری مالکن مسٹر کپور کے ساتھ آئی ہوئی تھی وہ لوگ ہال میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ مالکن نے پانی لانے کا اشارہ کیا۔ میں نے پانی اور سوڈا کی بوتل لاکر رکھ دی۔

مالکن نے باورچی کھانے میں آکر کہا ''تم کھانا کھا کر سونے چلی جاؤ۔'' میں نے مسکرا کر مالکن کی طرف خاص نظر سے دیکھا۔ اس نے پرس کھول کر پچاس کا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چلو میری لاٹری لگ گئی۔

جب بھی مالکن کپور صاحب کے ساتھ آتی تو سمجھو کے کچھ گول مال ہے۔ صاحب کمپنی کے دورے پر دوسرے شہر میں چلے جاتے تو ان کی غیر حاضری میں ہمارے گھر میں اکثر ایسا ہی ہوتا رہتا تھا۔ یہ پچاس روپے میری رشوت تھی میرا منہ بند رکھنے کا خاموش اشارہ تھا۔ میں اکثر سوچتی رہتی کہ گاؤں اور شہر میں کیا فرق ہے۔ وہاں پر بھی بس زندگی ویسی ہی تھی شراب، جسم فروخت۔ کھیتوں میں چوری چھپے ملنا۔ امیر زمیندار کھیتوں سے عورتوں کو اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے اور زبردستی کرتے۔ مروا ڈالتے۔ کنویں اور تالاب میں پھنکوا دیتے۔ تو کبھی کبھی زندہ چھوڑ دیتے۔ اور شہر میں کسی لاچاری اور بے بسی سے نہیں اپنی خواہش سے بہت سارے لوگ رنگین زندگی میں مست ڈوبے رہتے۔

کبھی مجھے گاؤں سے نفرت ہونے لگتی ہے تو کبھی شہر سے۔ کیا میری یہ نفرت کسی گاؤں سے یا کسی شہر سے؟ یا سارے لوگوں سے؟ لیکن گاؤں اور شہر میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔

ممبئ مہانگر میں بھی گھریلو کام کاج کرنے کے لیے گاؤں سے بہت سارے لڑکے لڑکیاں، عورت مرد آ کر بھر گئے۔ کچھ لوگوں نے برائی کو دیکھ کر برائی کو اپنا لیا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے برائی کو دیکھ کر بھی بھلائی کو گلے لگا رکھا ہے۔ ان پر آس پاس کے ماحول کا کوئی بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ جیسے ان کی تہذیب تھی ویسے ہی ہے۔ گاؤں اور شہر سے انھیں کوئی نفرت نہیں، لوگوں سے بھی نفرت نہیں۔ جیسی نظر ویسی دنیا!

جیسی میری بہن وِل، جو کمل کے پھول کی طرح کسی بھی بری عادت میں نہ پھنس کر گاؤں اور شہر دونوں کو پیار کرتی تھی۔ ایک محنت کی زندگی جی رہی ہے۔ کسی دن وہ ایک بھلے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر یا ماں سے کہہ کر اس کے پسند کے لڑکے سے شادی کروا کر ایک اچھی زندگی بتائے گی۔

اور میں۔۔۔؟؟ بچپن سے ہی بغاوت سے بھری ہوئی، نا انصافی اور بے عزتی کو پچا نہ سکنے والی ظلم اور غلط سلوک کے خلاف ردّ عمل کرنے والی۔۔ میرا مستقبل کیسا ہوگا؟؟ رام ہی جانے۔ کیا پکیا مجھ سے کیا ہوا شادی کا وعدہ نبھائے گا؟

ایک بدحواس پل

ایک بدحواس پل

منوہر نے ایک خط لکھنا شروع کیا۔ منجو اس بار میرا فیصلہ پکا ہے۔ بس اب ہم دونوں کو ملنا چاہیے۔ تم اور میں ایک لمبے عرصے سے چاہتے ہوئے بھی ملے نہیں ہیں۔ اپنے پاکیزہ پیار کی قربانی دے دی۔ ہم نے اپنی اپنی گھر گرہستی کا فرض اب تک پوری ذمہ داری سے نبھایا۔

اب ہمارے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی شادیاں بھی ہو گئی ہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ زندگی کے باقی بچے ہوئے پل ہم ایک ساتھ گزاریں۔ میں اپنی بیوی اور تم اپنے شوہر سے آزاد ہو جائیں۔ اور ہمیشہ کے لیے ساتھ رہیں۔

منوہر نے خط ختم کیا۔ لفافے میں ڈالا اس پر پیپر ویٹ رکھا۔ لیکن لفافے کو بند نہیں کیا۔ کیونکہ گوند کی بوتل اسے نہیں ملی۔ اس کے بعد وہ ٹہلتے ہوئے چھت پر آ گیا۔

آسمان پر تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور وہ تاروں کو دیکھنے لگا۔ ستارے اسے بہت پیارے اور اپنے اپنے سے لگنے لگے۔ وہ بچپن سے ہی تاروں کو گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا۔

ماں اسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہتی تھی۔ ''چھورا، سو جا! ساری ساری رات آسمان میں آنکھیں لگا کے جاگتا رہتا ہے۔ کیا ہے اس آسمان میں اور ان تاروں میں؟ پگلا، دیوانہ۔'' ماں گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا کرتی تھی۔

کچھ وقت تک وہ تاروں کی آنکھ مچولی کا کھیل دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ اسے یاد آنے لگا، معصوم منجو کا چہرہ اور اس کی آواز۔

''منوہر تارا ٹوٹ کر گرا، لیکن میں اپنے آنچل کی گھانٹ باندھ نہ سکی اور اپنی کوئی منّت

مانگ نہیں پائی۔ منوہر ہر بار میرے ہی ساتھ ایسا کیوں ہوتا رہتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں تارے ٹوٹنے کے وقت جوآرزو ہم کرتے ہیں وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ میں پاگل پھٹی ہوئی آنکھوں سے ٹوٹتے ہوئے تارے کو دیکھتی ہی رہ جاتی ہوں۔اور وہ میری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر غائب بھی ہوجاتا ہے۔ منوہر کیا اسی طرح ہم دونوں آپس میں مل نہیں پائیں گے؟ کیا ہمارا پاکیزہ پیار شادی کے منتروں اور شادی کے شامیانے تک پہنچ نہیں پائے گا۔

''منجو! شادی ایک رسم ہے۔ بھگوان کا دِیا ہوا عطیہ ہے۔ اس بات میں میرا بھروسہ ہے اور اگر دو پیار کرنے والے شادی کے بندھن میں نہیں بندھیں گے تو نصیب الگ الگ رکاوٹیں ڈالتا رہے گا۔''

منوہر نے منجو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا، ''منجو دیکھو تمھارے ماں باپ اپنے پارٹنر کے بیٹے کے ساتھ تمھاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہوا ہے۔ دونوں خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ انھیں کوئی نوکری کرنے والا داماد امیر، آرام پسند لڑکا اچھا لگتا ہے۔ تمھارے والد نے میرے ساتھ شادی کرنے سے منع کردیا ہے۔ انھوں نے مجھے ناپسند کیا ہے۔

منجو نے منوہر کے شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا، ''نہ صرف منع کیا ہے، ڈیڈی نے تو خودکشی کرنے تک کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ تم ہی بتاؤ! منوہر میں کیا کروں؟ میں ماں باپ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے راضی نہیں ہوں۔ میں ان کا دل نہیں توڑ سکتی۔''

منجو نے لمبی آہ بھر کر کہا، ''مجھے معاف کر دینا منوہر! زندگی میں میں نے پہلی بار تمھارے ساتھ پیار کیا ہے۔ اور تم سے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ بس بے جان مورتی کی طرح گھر گرہستی کی ذمہ داری نبھاتی رہوں گی۔ ایک مشین کی طرح جس میں دل کی دھڑکنیں نہیں

ہوتی ہیں۔ شاید کسی صحیح وقت پر ٹوٹتے ہوئے تارے کو دیکھ کر اپنے آنچل میں گھانٹ باندھ کر اپنی آرزو دوہرا سکوں۔ تمھیں پا سکوں۔''

چیکتی، روتی، سسکتی منجو نے مجھ سے رخصت چاہی اور پھر مجھ سے الگ ہوگئی۔ ایک قسم لے کر کہ مجھے بھی جلد ہی شادی کرنی پڑے گی کسی اور لڑکی کے ساتھ۔ ہم ایک دوسرے کے خاندان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ہماری گرہستی ایک ریاضت ہوگی، ہمارا پیار ایک عبادت۔۔

تن من سے ہم دونوں نے اس وعدے کو نبھایا۔ آج کیا ہوگیا ہے؟ منجو کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے اس کے بغیر ایک ایک پل بھاری ہو رہا ہے۔'' منوہر نے من ہی من میں کہا۔

گھڑی میں وقت دیکھا، وہ بڑی دیر سے چھت پر ٹہل رہا تھا۔ اسے کچھ یاد آیا زور زور سے ٹہاکے مار کر ہنس پڑا۔ آج منجو نے ٹوٹتے تارے کو دیکھ کر اپنی ادھوری آرزو پوری کرنے کے لیے تو نہیں مانگا ہے مجھے، کہ منوہر سے ملوں؟ وہ ایک بار پھر زور سے ہنسے پڑا اور نیچے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

اس کا منجو کے نام لکھا ہوا خط لفافے سے باہر پلنگ پر پڑا تھا۔ اس کے سر کی طرف دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا، مدھو اس کی بیوی کمرے میں آ کر گئی ہے۔ یہ خط پڑھ کر دودھ کا گلاس رکھ گئی ہے۔ اسے میری جوانی کے پیار کی جانکاری ہوچکی ہے۔

اس پر کیا گزری ہوگی؟ اف! وہ کیا سوچتی ہوگی؟ میرے اور منجو کے بارے میں ۔۔۔؟ ایک آوارہ بنجارہ خیال مجھے حقیقی دنیا سے کتنی دور لے گیا۔ ایک پل کی بہکانے والی سوچ نے ہم تینوں......نہیں نہیں ہم چاروں دو جوڑوں کی زندگیوں کو پریشان کر دیا۔

جس حادثے، جس پیار کے واقعہ کو قریب قریب پچیس سال ہو گئے ہیں۔ اس ماضی

کے ایک گزرے ہوئے پل کو پکڑ کر اپنی بیوی کو ایک چنچل بچے کے جیسا دکھ دے دیا۔ اس بے چاری نے تن من سے میری سیوا کی، مجھے اپنا ساتھ اور سہارا دیا۔ اس کے کسی جذبے کو دُکھانے کا حق میں نے کہاں سے پالیا؟ اس کا کیا قصور؟

کمرے کی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی اور اس نے لائٹ بجھا دی۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ صحیح ہے کہ منجو سے میں پیار کرتا تھا، کرتا ہوں۔ اس کی میٹھی میٹھی یاد آنا یہ فطری ہے پاکیزہ بھی ہے۔ لیکن اُن جذبات کو کسی کاغذ پر اُتارنا ایسی بے وقوفی مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وہ سوچنے لگا، اگر یہ خط منجو کے شوہر یا اس کے جوان بیٹے یا بہو کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو اس کا خاندان تنکا تنکا ہوکر بکھر جاتا۔ پیار کرنا گناہ نہیں ہے۔ لیکن اس کا اظہار اس ڈھلتی عمر میں کرنا ضرور گناہ ہے۔ منجو کا گھر جو اس نے برسوں کی تپسیا کے بعد بنایا ہے۔ اس میں رکاوٹ ڈالنا غلط ہے۔ پیار ایک احساس ہے۔ بہت اونچا شاندار، پاکیزہ جذبہ ہے۔

جس نے پیار نہیں کیا وہ سوکھے پیڑ کے جیسا ہے۔ ایک بے جان مشین وہ کسی کو پیار دے بھی نہیں سکے گا۔ جسے پیار نہیں ملا ہے، وہ انسان کم نصیب ہے۔

ماں آئی، اور پوچھا، ”ارے! منوہر بیٹا اندھیرے میں بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہے؟ لائٹ جلا دوں“؟

منوہر کے خیالوں کا تانا بانا بکھر گیا۔ منوہر نے جواب دیا، ”ذرا آرام کر رہا ہوں۔ ماں کیا کام ہے“؟

”اچھا، پندرہ بیس منٹ کے بعد پوجا گھر میں آجانا، آرتی جو کرنی ہے وہی کہنے کے لیے میں اوپر آئی تھی۔“ ماں نے کہا۔ اور ماں چلی گئی۔

”اچھا ماں!“ منوہر نے جواب دیا

اس کی سوچوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا۔ وہ خیالوں کے بھور میں ڈوبتا چلا گیا۔ ایشور کو بھی وہی انسان پیار کر سکے گا جو سچ مچ کسی کے پیار میں پورا بھیگا ہوا ہے۔ مدہوش، متوالا ، رادھا میرا، شاہ کی نائکا جسمانی طور پر نہیں ملے تو کیا ان کا پیار سچا نہیں تھا؟ انھوں نے پیار کو رسوا نہیں کیا۔ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ کیا کر ڈالا میں نے؟

منوہر کا ضمیر اسے کوسنے لگا۔ اس کی روح اسے دھتکارنے لگی، اس نے منجو کے خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ اور دودھ کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

ایک دھکا لگا، اس کے ہاتھوں کو، اس ہاتھ میں تھامے گلاس کو۔ دودھ فرش پر گر کر پھیل گیا۔ گلاس کو دھکا مارنے والی مدھو ہی تھی۔ گلاس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے مدھو کی آنکھوں میں دیکھا، بے حد محبت تھی اور ڈر بھرا ہوا تھا اُن آنکھوں میں۔ مدھو نے اسے آغوش میں بھر لیا اور پھسپھسائی۔

''پیارے، سب بھول جاؤ۔ فرش پر گرے ہوئے دودھ کو بٹورنے سے کیا فائدہ؟ ماضی، ماضی ہی ہوتا ہے۔ ہر گزرا ہوا پل ماضی بن جاتا ہے۔ حال سے اسے کیوں جوڑیں؟ آؤ سب بھول جاؤ۔''

دونوں کی نگاہوں نے ایک ساتھ ایک پل میں دیکھا کہیں سے ایک بلی آئی، فرش پر پھیلا دودھ چاٹنے لگی اور تڑپنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مر گئی۔ زہر نے اپنا اثر دکھایا۔

فرش پر بکھرے ہوئے تھے کانچ کے ٹکڑے، دودھ گرا ہوا، مری ہوئی بلّی اور کاغذ کے محض چند ٹکڑے۔

خوددار

خوددار

پونہ کا سارس باغ، تہہ میں زندہ گنپتی، پاروتی سومیشور مندر ایک تاریخی مقام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاس ہی میں جانوروں کا زو...... ہمارے اپنے بچپن اور بچوں کے بچپن کی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔

میری بہن، بہنوئی جن کا بچپن جوانی کا سارا وقت پونہ ہی میں گزرا ہے اور اب وہ کافی عرصے سے حصولِ معاش کے سلسلے میں بدیس میں ہی رہتے ہیں۔

ہم یہ تاریخی چیزیں پھر سے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

ہم لطف لے لے کر ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ ہر چیز کی بدلی کا معائنہ کرر ہے تھے۔

بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکی سے جی گھبرا رہا تھا۔ پرانے دن یاد آرہے تھے۔ پہلے والے سارس باغ میں لگے ہوئے رنگ برنگی فوارے، ہری ہری گھاس، صاف صفائی کے منظر اب نہ دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

گھومتے گھامتے تھک کر ایک خالی بینچ پر ہم سب بیٹھ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سب کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

ایک عورت آوازیں لگاتی آرہی تھی، وڑے لے لو، گھر گوتی وڑے (گھر میں بنے آلو وڑے) صاحب یہ وڑے گھر میں بنے ہیں۔ صاف تیل میں اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے محنت سے بنے ہوئے۔

وہ عورت لمبی، گوری، تیکھے نین، نقش والی نوگز کی ساڑی پہنے ہوئی تھی۔ پرسکون چہرہ،

آنکھوں میں روشنی، کسی بھلے اچھے خاندان کی لگ رہی تھی۔

میرے بہنوئی جن کا نام سریش ہے۔ انھوں نے اس سے وڑے خریدنے کے اراد ے سے پوچھ لیا ''اگر وڑے تازے، صاف تیل میں بنے ہیں تو دے دو۔ اس نے تین وڑے چٹنی کچھ ہری مرچ کے ساتھ دے دیے۔

اس نے کہا، ''صاحب دس روپیہ ہوگئے۔''

میرے بہنوئی نے ایک بڑا سا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، ''باقی پیسے تم رکھ لو۔''

یہ سن کر وہ بھڑک گئی اور تھوڑے غصّے بھرے لہجے میں کہہ دیا، ''میرے دس روپیہ ہوئے باقی روپیوں کے وڑے خریدیں یا بچے ہوئے پیسے لے لیجیے۔ میں بھیک نہیں مانگنے آئی۔''

باقی بچے ہوئے پیسے ان کی ہتھیلی پر رکھ کر وہ چل دی۔ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے، آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

ہم ہکّے بکّے اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور سوچنے لگے، ''کیا آج کل کی دنیا میں اتنی ایماندار اور خوددار مزاج لوگ موجود ہیں؟''

کافی دیر تک ہم اس بات پر بحث کرتے رہے۔ کچھ ایمانداری اور کچھ بے ایمانی کی مثالیں دیتے رہے، کوّوں کی کائیں کائیں، چڑیا اور دوسرے پرندوں کی آوازوں سے ہمیں ہوش آیا کہ کافی دیر ہوگئی ہے۔ اندھیرا گھِر آیا ہے۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

گیٹ تک جاتے جاتے ہمیں وہ وڑے بیچنے والی عورت پھر دکھائی دی۔ میری بہن نے آواز دے کر بلا لیا اور کہا، ''کچھ وقت ہم تم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ آؤ اس ہریالی پر بیٹھ جاتے ہیں۔''

اس نے ساڑی کے پلو سے اپنا پسینہ پونچھ لیا اور لمبی سانسیں بھر کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کا نام پوچھا، ''اس نے اپنا نام لکشمی کامبلے بتایا۔''

میری بہن نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''لکشمی تم نے وہ زیادہ پیسے کیوں نہیں لیے، ہم تمھیں بھیک نہیں مدد کرنا چاہتے تھے، کیا تمھیں پیسوں کی ضرورت نہیں؟''

''ضرورت تو ہے میم صاحب! کتنی بھی محنت کرو روپیہ کماؤ پیسے پورے نہیں پڑتے۔'' پیسوں کو تو پنکھ لگے ہوئے ہیں لیکن ہم نے طے کیا ہوا ہے۔ محنت کے پیسوں سے ہی گزارا کریں گے۔'' لکشمی نے جواب دیا۔

''تمھارے گھر میں اور کون کون ہیں''؟ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

اس نے نپے تلے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میری ساس، ہمارے تین بچے ہیں۔ میرا شوہر جو اپاہج ہے۔ انھوں نے تو پلنگ پکڑ لیا ہے۔ ان کے دونوں ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ وہ فوجی تھے۔ ایک جنگ میں جسم کا ایسا حال ہو گیا وہ مہینوں اسپتال میں تھے۔ جسم میں زہر پھیل جانے سے ٹانگ پر بھی اثر پڑا ہے۔ دماغی طریقے سے ٹوٹ چکے ہیں۔ تھوڑے چڑ چڑے سے بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے دل کی حالت خراب ہے۔

میری ساس سوئیٹر اور اونی کپڑے وغیرہ بُن کر بیچتی ہے۔ بچی پڑھائی کرتے ہوئے سلائی کا ڈپلوما کر کے سلائی کرتی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے کچھ نہ کچھ کر کے اپنی پڑھائی کا خرچہ نکال لیتے ہیں۔ ساس اور بیٹی وڑے بنانے میں بھی میری مدد کرتی ہیں۔

''تمھارے شوہر کو سرکار کی طرف سے معاشی طور میں کیا ملا''؟ میرے بہنوئی نے پوچھ لیا۔

''پنشن ملتی ہے۔ گھر دیا ہے۔ صاحب ہم دیش بھگت ہیں۔ میرا سسر بھی فوجی تھا۔ اب

میں اپنے بیٹے کو بھی فوجی ہی بناؤں گی ، ایسا ہم سب کا ارادہ ہے۔''

میں نے کہا'' ہمارے جوان تو دیش کی سرحدوں پر لڑتے ہیں جسم کے حصے کھوتے ہیں، کبھی شہید بھی ہوجاتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ فوجی!''

''تم سب بھی تو بچے اور عورتیں فوجی سے کسی طرح کم نہیں ہو۔ تمھاری ساس ، بیٹی اور تم ۔گھر کے معاشی حالات کا مقابلہ کتنی بہادری سے کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

لکشمی کے ہونٹوں پر فتح یابی کی مسکان پھیل گئی۔

میری بہن نے اس سے ایک بے تکا سا سوال پوچھ ڈالا، ''لکشمی تم اتنی خوبصورت، صحت مند عورت ہو۔ جی نہیں چاہتا کہ تم کار میں گھومو، خوبصورت گہنوں اور پوشاکیں پہنو۔ ملٹری کوارٹرس میں رہنے والی دوسری عورتوں کو عیش وعشرت کرتے ہوئے ، تمھارے دل میں حسد نہیں پیدا ہوتا؟ یا خیال نہیں آتا کہ میں بھی عیش و آرام کی زندگی جی لوں۔''

''ایسی عورتوں کے کردار کیسے ہوجاتے ہیں؟ ان کی عزت اور خاندان کی عزت کہاں رہتی ہے؟'' اس نے کہا،'' وہ کیسے؟ میں نے ہی پوچھ ڈالا۔

پیسوں کے لالچ میں آ کر ملٹری کوارٹرس میں رہنے والی ایک خوبصورت سی عورت ایک امیر آدمی کی سنگت میں پھنس کر کاروں میں گھومنا، بڑی بڑی ہوٹلوں میں کھانا، گہنے ، کپڑے اس کی کمزوری بن گئی تھی۔

اس عورت کے کردار کی گراوٹ کی وجہ سے بے عزتی اور لوگوں کے طعنوں سے زخمی ہوکر اس کے شوہر نے خوکشی کرلی ۔ بچوں کو ذلیل زندگی جینی پڑ رہی ہے۔ زیادہ پیسوں کے لالچ اور حرص کا کتنا بھیانک نتیجہ ہوتا ہے۔

''یہ تو بہت برا ہوا'' بہنوئی نے کہا۔

''ہاں، ایسا ہی بولا جاتا ہے۔ حرص، لالچ اور مسابقت کے سبب، خودداری، عزتِ نفس، خود کفالت سے جینے والے ہی سکھ اور خوشحالی کی دنیا میں رہ پاتے ہیں'' میں نے کہا۔

ماحول بہت ہی مایوس ہو چلا تھا میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میری بہن کی آنکھوں میں آنسو چھلچھلا آئے تھے۔ میرے بہنوئی کا دل بھی بوجھل تھا۔

ایک رنگین غبارہ نہ جانے کیسے ہمارے بیچ آٹپکا۔ چوکنے کے ساتھ خوشی کی لہر بھی دوڑ گئی۔ کیوں کہ ایک ننھا منا پیارا سا بچہ وہ غبارہ لینے دوڑتا آ گیا۔ وہ ہنستا، کھلکھلاتا، کلکاریاں مارتا ہوا بچہ بہنوئی نے اُٹھا لیا اسے، پیار کیا، دُلارا، گلے لگایا، چاکلیٹ دیا۔ وہ ننھا فرشتہ، ہنستا دمکتا اپنا غبارہ لے کر بھاگ گیا۔

ماحول پرسکون ہوگیا بوجھل موضوع ہلکا پھلکا بن گیا۔ ہماری ہنسی کی گونج نے آس پاس کے لوگوں کو بھی ہنسا دیا۔

لکشمی کی خودداری کی حفاظت کرتے ہوئے سارے وڑے ہم نے خرید لیے۔ اور ہمارا دل اس بہادر فوجی عورت کے احترام میں جھک گیا۔

سارس باغ کے گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے ہمیں یاد آیا۔ کلپنا بھیل کا اسٹال۔ جس اسٹال سے بچپن سے جوانی تک ہم بھیل کھاتے آئے تھے۔ بھیل کا آرڈر دے کر، ناریل پانی لے کر جیجاجی آ گئے۔

انھوں نے میری سوچ میں ڈوبی صورت دیکھ کر کہا، '' اب تک لکشمی کے بارے میں سوچ رہی ہو؟''

میں جب تک کچھ کہوں، میری بہن نے بیچ میں ہی ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''سچ مچ پیسے کمانے کی لالچ نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔ خودداری، محنت، مقابلہ آرائی، انسانیت، عزت، اصول ہم لوگوں کی زندگیوں سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔

میں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ "ہمارے بھارت کے مستقبل نوجوان ودیشوں کے پیسے کی مدد سے بنائے ہوئے کال سینٹر میں کام کرتے کرتے روزمرہ کے معمولات بدل جانے سے اپنی صحت گنوا دیتے ہیں۔ صحت مندی کتنی قیمتی ہوتی ہے۔ کھونے کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے۔

بھرشٹا چار تو توبہ توبہ! چلو اُمید کی ایک کرن، اپنے ضمیر سے فیصلہ کرنے والی لکشمی نے ہماری نا اُمیدی کو کم کر دیا۔ جیجا جی بول پڑے۔

گھر کے بنے وڑے، بھیل کھا کر اور ناریل پانی پی کر اور پھر خوددار لکشمی کے ساتھ باتیں کر کے پونے کے سارس باغ کی یادیں ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئیں۔

سہیلی

سہیلی

بوڑھی اماں رو رو کے سسکیاں بھرتی ہوئی کہے جا رہی تھی، ''بندو میری بیٹی بندو۔۔۔تم کہاں کھو گئی؟ اتنی چھوٹی عمر میں کیوں دنیا چھوڑ گئی؟'' وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر، بلک بلک کر بیان کر رہی تھی۔ ''ہائے! میں نے اپنی بندو کھو دی، میری جوان لڑکی کھو دی۔۔۔کیا موت کو شرم نہیں آتی؟ ہمارے جیسے بوڑھے جی رہے ہیں، اور جوانوں کو کھا رہی ہے؟ اوہ! میں مر کیوں نہیں جاتی؟ کوئی مجھے میری بندو واپس دے دے۔۔۔ میری بٹیا۔۔۔''

کسی نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''ارے! اماں تم نے گیان کی اتنی باتیں سنی ہیں، اب یہ اگیانی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ کھوئی کہاں بیٹی؟ دیکھو اس میں دیکھو، تمھاری لڑکی ہے۔۔۔۔'' سب عورتوں میں اپنی بیٹی کو دیکھو۔

اس نے 'نہ' کہہ کر گردن جھٹک دی، میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی، یہ میری بندو ہے۔ کیونکہ اس کا نام بندو ہے۔ اور میری بیٹی کی سہیلی ہے۔ اس نے آخری دنوں میں مجھ سے فون پر باتیں کرتے ہوئے کہا تھا، ''اماں مجھے اس شہر میں ایک سہیلی مل گئی ہے، جو بالکل میرے جیسی ہے، بہت پیاری ہے سو یہی میری بندو ہے۔

میں نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ اس نے خود اعتمادی سے کہا، ''میں کسی کو بھی اپنی بیٹی کیسے مان لوں گی۔ اس وقت مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا ہے، مجھے معاف کر دو۔۔۔''

سارے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے۔ اتنا کڑوا سچ کوئی کیسے بول سکتا ہے۔ تکلف کے مارے سب لوگ جھوٹ کا نقاب اوڑھ کر ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ قسمت کی ماری بدنصیب ماں۔۔۔ بلک بلک کر کہہ رہی۔۔ میں کیا کروں اس اندھے موہ کو؟ میں بہت ہی جذباتی

عورت ہوں۔

اپنے آنسوؤں کو روک پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سو اُٹھ کر پانی کے مٹکے کے پاس چلی گئی۔ لوٹے سے پانی نکال کر آدھا پانی کا گلاس بھرا۔ خاموش ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے پانی پینے لگی۔ مانو اتنی درد بھری آگ کو گلے سے اُتار کر ٹھنڈے پانی سے بجھانے لگی۔

خود کو اس طرح سے سنبھال لیا اور 'ہری اوم'' کہہ کر گھر سے باہر نکلنے لگی۔ بوڑھی اماں نے ہاتھ تھام لیا۔ میں نے چہرے پر زبردستی ایک مسکان چپکا کر کہا، ''کل شام کو چار بجے آؤں گی۔''

جب کبھی میرے دل پر برداشت سے زیادہ بوجھ جمع ہوجاتا ہے۔ تو میں گھر کے پاس والی واٹیکا میں اپنے جذباتی دل کو خاموش کرنے، اکیلے میں ٹہلنے چلی جاتی ہوں اور دھیرے دھیرے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

زندگی عارضی ہے۔ پتہ ہے کبھی بھی بے وفا جسم انسان کو چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن جوان انسان ہٹا کٹا، ہنسمکھ، زندگی کی توانائیوں سے بھرپور، خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا پرا انسان جب اچانک ہی تین چار گھنٹوں میں موت کے منہ میں چلا جاتا ہے تو اس کے آس پاس کے لوگ کتنے اُداس اور دُکھی ہوجاتے ہیں۔ ایسے جوان کی موت کو برداشت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

بندو کی یاد آنے لگی۔ پچھلے دو مہینوں میں ہم کتنی گہری سہیلیاں ہو گئی تھیں۔ بار بار ملنے لگی تھیں۔ وہ پہلی بار پونہ آئی تھی۔ اس کے بیٹے نے شادی کے بعد اپنا گھر یہیں بسا لیا۔ وہ اپنے بیٹے بہو اور پوتے سے ملنے آئی تھی۔ اور کچھ پل گھر سے نکل کر ستسنگ میں بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اور میرا گھر ستسنگ اور اس کے نئے گھر کے بیچ میں ہی تھا۔ ہم ملتے رہے اور ایک دوسرے سے کھلتے رہے۔

ہم دونوں کا ایک ہی نام، سوچ بھی ایک سی، پسند بھی ایک جیسی ہی تھی۔ سو جوڑ آ تماؤں کا ملن جیسا سب کچھ ہو رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ شام اتوار کے دن ہم لوگوں نے طے کیا تھا کہ آئندہ گرووار کو ستسنگ جائیں گے۔ میں نے بدھ کے دن گھر فون کیا، کسی لڑکے نے فون اٹھایا تھا اور کہا،'' بندو دیدی اس دنیا میں نہیں رہی۔ اس کی آخری رسومات کرنے کے لیے بھوپال لے گئے ہیں۔''

کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بات کر رہے ہو؟ میں تم سے بندو کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، جی میں، بندو جی کے بارے میں ہی کہہ رہا ہوں۔''

''کیا ہوا اسے؟'' میری آواز میں بے پناہ درد تھا۔

''اچانک ان کی طبیعت منگل کے دن خراب ہوئی۔ اسپتال لے گئے آپریشن کیا۔ لیکن صحیح علاج نہ ہوا اور وہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے گزر گئی۔''

میں نے کہا،'' مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ تم کون ہو؟ مجھے بھوپال کا فون نمبر بتا دو۔ میں وہاں سے کسی سے پوچھتی ہوں۔''

وہ لڑکا بندو کی بہو کا بھائی تھا، اس نے مجھے نمبر دیا۔ میں نے جلدی نمبر لیا اور فون کیا۔ فون پر اس کی بہو اور بہن سے بات ہوئی۔ انھوں نے وہی بتایا جو اس لڑکے نہ کہا۔ میرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ بے ہوش سی ہونے لگی۔

ایک دو دنوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی انسان کبھی بھی ہمیں چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا جسم بھی بے وفا ہے۔ میرے والد، ماں دونوں بڑے بھائی ایسے ہی اچانک !

گزر گئے تھے۔ ایسا سب کچھ بہت سنا دیکھا۔ کتابوں میں پڑھا ہے لیکن سامنے اچانک برداشت کرنا کتنا مشکل ہے۔

واچ مین کی سیٹی نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ باغیچے کا گیٹ بند کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں گھر لوٹ آئی اور روز مرہ کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

دوسرے دن شام کو چھ بجے بندو کی بہن منجو کا فون آیا، ''بندو تم آئی نہیں؟ اماں چار بجے شام سے تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔''

میں نے کہا، ''میں نے یہ سمجھا اتنی ساری عورتوں کی بھیڑ میں ۔۔ اماں مجھے ضرور بھول گئی ہوں گی۔ سو میں بے فکر تھی۔''

''نہیں، بندو تم جلدی آ جاؤ، وہ تمھیں اپنی بیٹی بندو ہی سمجھ رہی ہیں۔''

میں گھر کی باورچی کرنے والی لڑکی کو کچھ ضروری ہدایت دے کر نکل پڑی۔

راستے میں ماضی کی بہت سی یادوں نے مجھے گھیر لیا۔ میری بھابھی، ماں، بھیا سب کی موت اچانک اور ایسے ہی تین چار گھنٹوں میں ہی ہوئی تھی۔ میں ان صدموں سے اپنے دو چھوٹے بچوں کی وجہ سے ہی نکل سکی تھی۔ وہی دونوں میرے جینے کا مقصد تھے۔ جنھیں ایک نڈر، بہادر ماں کی ضرورت تھی۔ جو انھیں پڑھائے لکھائے بہت بڑا بنائے۔ وہ بھی دنیا میں نام کما کر جائے۔ بس ان دونوں کو کچھ بنانے کی دھن میں پہاڑ جیسے دکھ برداشت کرتی میں اندر لہو لہان ہوتے ہوئے بھی مسکراتا چہرہ لے کر جیتی رہی۔ اندر بے حال ٹوٹی، بکھری۔۔۔ ایک فوجی کی طرح زندگی تھی میری۔

اب کیا کرنا ہے مجھے؟ ایسی دل کی مریض، بوڑھی ماں کو اس کی جوان بیٹی کی موت پر تسلی دینی ہے۔ اور جھوٹا ڈرامہ کرنا ہے۔ ''میں ہی ان کی بیٹی بندو ہوں؟ نہیں۔۔۔ میں اس کا یہ وہم توڑ دوں گی۔ اسے یہی دھیرے دھیرے سمجھاؤں گی، ان کی بیٹی کی موت ہو چکی ہے۔

صرف کسی کا نام بندو ہے تو وہ زندہ نہیں ہے۔ کوئی بھی بندو جیسی نہیں ہو سکتی۔ بندو کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ بندو۔۔۔ بندو ہی تھی۔ وہ ان کی بیٹی جو تھی۔ جواب نہیں ہے۔ اسے وہ کسی میں بھی تلاش نہ کرے۔ من پکّا کر لے۔ ایک بار رو کر دل ہلکا کر لے۔ جھیل لے اس صدمے کو۔

میں نے اپنے والد، ماں۔ دو بھائی جو مر چکے تھے دوسرے لوگوں میں بہت ڈھونڈے لیکن کسی میں بھی کوئی نہیں ملا تھا۔

ویسے بھی رشتوں میں کون سے سکھ ہوتے ہیں؟ جو آس پاس زندہ ہوتے ہیں۔ اس سے ہم لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اور جب وہی ہمیشہ کے لیے موت کے نام سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان کے بغیر جی نہیں سکتے۔ عجیب ہیں ہم سب لوگ ۔۔۔ خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا، جب رکشا کھڑی ہوگئی اور رکشا والے نے بڑی آواز میں کہا، ''جگہ آ گئی آنٹی، بل دے دیجیے۔''

میں نے پرس میں سے پیسے نکال کر دے دیے۔ لفٹ کا دس نمبر دبایا، گھر کی گھنٹی بجائی۔ میں بہت ہی خاموش اور چپ تھی۔ بوڑھی اماں بندو کی بہن اور سارا خاندان میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھی اماں نے مجھے بغلگیر کرلیا۔ پل بھر کے لیے میں بھی بھیگ اُٹھی، مجھے میری اماں یاد آ گئی۔

اماں کی آغوش میں اتنی حرارت، اتنا اپنا پن، اتنا پیار تھا۔ نہ وہ اپنے آپ کو روک سکی اور نہ میں۔ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ میں پگھل رہی تھی۔ سینے پر ایک پتھر تھا جو پگھل رہا تھا۔ جی کھول کر رونے میں کتنا سکون ہے، اس کا احساس ہوا۔

بہو نے پانی لا کر ہم دونوں کو دیا۔ بیٹھ کر خاموشی سے پانی کے گھونٹ پینے لگی۔

بوڑھی اماں نے کہا، ''جانتی ہوں، گئی ہوئی بندو واپس نہیں لوٹ آئے گی۔'' ہم ایک

ساتھ رو تو سکتے ہیں، اس کی کڑوی میٹھی یادیں دہرا کر۔"

میں نے دل ہی دل میں اس ماں کو پرنام کیا۔

پھر سلسلہ شروع ہو گیا۔ بندو کی باتوں کا ۔۔۔ اسے ٹی وی دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ فلمیں تو بہت ساری دیکھا کرتی، ہنسنا، ہنسانا اس کا شوق تھا، بہت اچھے کپڑے پہننا، اسے اچھا لگتا تھا۔ اماں نے اس کی الماری دکھائی، دیکھو یہ چار ڈریس اس نے ابھی سلوائے تھے۔ پہنی بھی نہیں۔

اس طرح روز تین دنوں تک میں سارے خاندان سے ملتی رہی۔ ہم سارا وقت بندو کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ بیچ بیچ میں چائے پانی ناشتہ چلتا رہتا۔

میں نے دیکھا اب ۔۔۔ ہم صرف اس کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ میٹھی اور کڑوی باتوں کا آدان پردان کرتے رہتے تھے۔

کل وہ لوگ بھوپال جانے والے تھے۔ آخری دن تھا ملنے کا بس۔ سب کچھ ویسے ہی چل رہا تھا۔ بوڑھی اماں نے کہا میں اندر جاکے آتی ہوں۔ ہم لوگ گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ اندر اچانک دھڑام سے آواز آئی، ہم اندر بھاگے۔۔۔ بوڑھی اماں بوجھ نہ سنبھالنے کی وجہ سے لڑکھڑا گئی تھی۔ چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی۔ ہم نے انھیں پلنگ پر لٹایا، پنکھا چلایا، وہ تھوڑی پرسکون ہوئی، اور مجھے گلے لگا کر کہنے لگی،"تم ہی میری بندو ہو مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔ بندو مری نہیں، تم ہی میری بندو ہو۔"

اب دو دنوں سے تو اماں پرسکون تھی۔ آج پھر اچانک یہ کیا ہو گیا؟ وہ پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ ہم پریشان ہو گئے۔ گھبرا گئے۔ تھوڑی سی ہمت جٹا کے انھیں پانی پلایا۔ تھوڑا وقت گزر جانے کے بعد بہو نے بتایا، آج انھوں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ کچھ دیر ان کو آرام دلانے کے بعد، ہم نے تھوڑی سی گرم گرم کھچڑی کھلائی، ہلکی نیند کی گولی دی۔ سلا دیا۔

میں بوجھل دل سے لوٹ آئی۔۔۔ اپنے گھریلو کاموں میں مصروف ہو گئی۔

دوسرے دن وہ لوگ بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں انھیں الوداع کرنے نہیں گئی۔ بندو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔ جو جنم لیتا ہے ایک دن ضرور مرتا ہے۔ یہ جسم ضرور ساتھ چھوڑتا ہے۔ کبھی اچانک، کبھی برسوں اسپتال کے بستر پر پڑ کر۔۔ رشتہ دار بھی تھک کر دل ہی دل میں دعا کرتے رہتے کہ اتنے جسمانی عذاب جھیلنے سے تو اچھا ہے ایشور اس کے جسم کو خاموش کر دے۔

اماں کی بندو مر چکی ہے۔ سچ مچ ہمیشہ کے لیے کھو گئی۔ اور میں ان کی بندو نہیں ہوں۔ اس کی ایک میٹھی یاد ہوں۔ سہیلی ہوں۔

یہ سب سوچ کر میں نے اپنے آپ کو خاموش کر لیا اور سنبھال لیا۔

نئے رشتے

نئے رشتے

وہ سفید شلوار اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ سفید موتیوں کا ہار جو امریکن ہیروں سے جڑا ہوا تھا، اس کے گلے میں اچھا لگ رہا تھا۔ چوڑیوں، انگوٹھیوں نے میرا دھیان کھینچ لیا تھا۔

وہ چالیس پچپاس کی عمر کی، درمیانے قد والی، جسم نہ موٹا نہ بہت دبلا، گیہواں رنگ تھا اس کا، آنکھوں میں کاجل، آنکھیں گہری کالی، جاندار، چنچل، آنکھوں کی بھنویں کمان جیسی، جسم شوخی اور چنچلتا سے بھرا ہوا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ فطری طور پر مسکان کے جواب میں مسکان ہی ملتی ہے۔ مجھے بھی اس کا جواب مسکان میں ملا۔ وہ میری طرف آئی اور کہنے لگی آپ کی مسکان میں مقناطیس جیسی کشش ہے۔ میں نے اس کی بات پر ایک قہقہہ لگایا۔

کبھی کبھی میں کسی کی بات کا جواب قہقہہ لگا کر دے دیتی ہوں۔ جو صرف سمجھ دار ہی سمجھ پاتا ہے۔

ستسنگ کے ہال میں اگربتی، دھوپ، دیپ کی وجہ سے ماحول پاکیزہ لگ رہا تھا۔ جس سے مجھے اس سے باتیں کرنے میں مزہ اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے بہت پیار اور اپنے پن سے اس کا نام پوچھا، اس نے مسکرا کے جواب دیا، ''منجو''۔ مجھے اس کا نام بہت ہی میٹھا اور نازک لگا۔

میں نے اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ میرے گھر کے آدھے فاصلے پر تھا۔ تو ہم ایک رکشا میں سوار ہوئے۔ جب اس کا گھر قریب آیا تو اس نے دس کی نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دی۔

''بھئی یہ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''آدھے راستے کا کرایہ'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے انکار کرتے ہوئے کہا،''یہ پہلی بار ہے۔ دوسری بار تم دے دینا۔''

ایک ہفتے کے لیے کسی وجہ سے میں میکے گئی اور منجو سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اور پھر باقاعدہ ستسنگ میں جانا شروع ہوگیا۔ اس نے کسی دن اپنے گھر آنے کو کہہ دیا سو ایک فرصت بھرے دن میں اس کے گھر چلی گئی۔

کسی بھی انسان کی حقیقت جاننے کے لیے اس کے گھر میں جاکر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

گھر کا دروازہ مصوری کا نمونہ تھا۔ گنیش جی کا تورن، چمکتا ہوا اوم اور اس کے نیچے جھولے لال کی مورتی دیکھ کر میں مسکرائی اور کہا،''منجو تم تو پوری سندھی ہو، اس نے صرف مسکرا کے خاموش جواب دیا، اس نے چابی سے دروازہ کھولا، اس کے سوا اندر کوئی نہیں تھا، کون کون ہوں گے اس کے خاندان میں؟

دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا،''کوئی نہیں رہتا میرے ساتھ۔ اس گھر میں میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔ میں حیران ہوگئی، اس نے میرے خاموش سوال کا جواب کیسے دے دیا؟

صوفے پر بیٹھنے کی گزارش کرکے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

ہال میں ایک چھوٹا سا مندر تھا، جس میں کئی مورتیاں رکھی تھیں۔ زیادہ تر کرشنا، رادھا، میرا کی۔ ایک دیپک جل رہا تھا۔ اور اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اگربتیاں جل کر راکھ بن چکی تھیں، دیوتاؤں پر پھول چڑھائے ہوئے تھے۔ منجو سویرے سویرے پوجا بھی کرتی ہے۔ ایک لال گٹھری میں کچھ گرنتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے منجو سے اجازت لے لی۔ لال گٹھری کھول کر دیکھنے کی۔

گٹھری کے اندر بھگوت گیتا، سکھ منی، مہابھارت رامائن اور جپ صاحب وغیرہ گرنتھ

بندھے ہوئے تھے۔

کون پڑھتا ہوگا یہ گرنتھ؟ میں نے دل میں سوچا،'' میں پڑھتی رہتی ہوں روز صبح اور رات کو، دل، دماغ اور روح کو خاموش کرنے کے لیے۔''

میں حیران ہوگئی ۔ وہ لال گٹھری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا،'' منجو جو بات جو سوال میں اپنے دل میں سوچتی ہوں، تم اس سوال کو کیسے پڑھ لیتی ہو اور جواب دے دیتی ہو''؟

''آپ کی آنکھیں دیدی'' جن میں تلاش، بے قراری، کچھ جاننے کی آرزو، آنکھوں میں ہی پوری طرح سے سوال اُبھر آتے ہیں۔ آپ کا چہرہ بھی کوئی پڑھ سکتا ہے۔'' میں اس کا جواب سن کر ہنس پڑی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چاندی کی ٹرے تھی اور اس میں ایک خوبصورت چاندی کا گلاس تھا۔ جس میں شربت تھا، اور چاندی کی پلیٹ میں نمکین بھی تھا۔ کھاتے ، پیتے میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا،''تم اکیلے کیوں رہتی ہو؟ تمھارے خاندان میں اور کون کون ہیں''؟

''میرا بیٹا، بہو اور پوتا۔ میرے شوہر کا انتقال ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہوا۔ تب میرا بیٹا صرف بارہ سال کا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ میں نے دلاسا دیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی ، سسکیاں بھرتی ہوئی وہ روتی رہی، روتی ہی رہی۔۔ کچھ پل میں نے اسے رونے دیا پھر پانی کا گلاس لانے کے لیے میں باورچی خانے کی اور چلی گئی۔ پانی کا گلاس بھر کے میں نے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ پینے کو کہا۔

ہچکیاں اور سسکیوں کے بیچ وہ کہتی رہی ،''دیدی، میری زندگی تباہ ہوگئی ہے، میں کہیں کی نہیں رہی، کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی، جی کرتا ہے خودکشی کرلوں۔''

میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا،''پگلی خودکشی کی باتیں نہ کر خودکشی تو بزدل،

کمزور اور سامنے آئی ہوئی پریشانیوں کا مقابلہ نہ کرنے والے کرتے ہیں۔ جسم تو مندر ہے، جس میں بھگوان کا گھر ہوتا ہے۔ تم کمزور نہیں ہو، ایک بیوہ ہوتے ہوئے بھی تم نے اپنے بیٹے کی پرورش کر کے اسے اپنے پیر پر کھڑا کیا۔ اب وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔ تمھارے سے الگ کیوں ہو گیا؟''

''دیدی، میں اس وقت ان سوالوں کے جواب دینے کے قابل نہیں ہوں، کسی دن ضرور دوں گی۔'' اب وہ خاموش تھی اور نڈھال بھی۔

اس نے باورچی خانے میں جا کر چائے بنائی، اور ہم دونوں چائے پینے لگیں۔

میں نے اسے یاد دلایا، ''منجو میں تو تمھارے ہاتھوں سے بنی ہوئی مورتیاں اور دیپک دیکھنے اور خریدنے آئی ہوں۔ کیا تم بھول گئی، چلو اٹھو۔۔ وہ معافی مانگتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔'' دیدی، میں تو بھول ہی گئی، ابھی لاتی ہوں، وہ اندر چلی گئی۔''

میں سوچنے لگی ایسا کیا ہوا ہوگا منجو کی زندگی میں کہ وہ خودکشی کرنے کی تک سوچ رہی ہے؟

منجو ایک باکس میں چند مورتیاں اور بہت خوبصورت دیپک لے آئی۔۔ رادھا، میرا، کرشنا، گنپتی اور لکشمی کی مورتیاں اس نے بنائی تھیں جو بہت ہی خوبصورت تھیں۔ مورتیوں کے چہرے بہت خوبصورت اور پُرکشش تھے۔ ان میں سے میں نے کچھ رکھ لیے، باقی اسے لوٹاتے ہوئے کہا، '' تم نے تو بے جان مورتیوں میں جان پھونک دی ہے۔ کمال ہے تمھاری مصوری اور ہاتھوں کا۔''

میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا رات ہونے آئی تھی۔ میں نے منجو کو کہا ''چلو، اب چلتی ہوں۔ پھر کبھی ملیں گے۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے چھوڑنے نیچے تک آئی۔ ہم نے مسکرا کر ایک دوسرے سے الوداع لی۔

منجو کی باتیں سن کر میرا دل بوجھل ہوگیا۔ رات بھر میں کروٹیں بدلتی رہی، آنکھوں میں نیند کا نام ونشان ہی نہ تھا۔

دوسرے روز جتنا جلد ہو سکا گھر کے کام کاج نپٹا کر میں منجو کے گھر اس سے ملنے چل پڑی۔

دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے دروازہ کھولا اور حیرت سے مجھے نہارنے لگی۔ میں اس کا حلیہ دیکھ کر ہنس پڑی۔

''کیا بات ہے؟ ایک تو اچانک گھر آ گئی ہو؟ خوشی کے مارے میرے پیر زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے، اوپر سے ہنس ہنس کر نڈھال ہورہی ہو کا نتا؟'' اس نے کہا۔

میں نے ہنستے ہنستے اسے آئینے کے آگے کھڑا کردیا۔۔۔''اُئی ماں'' وہ چیخی۔۔''کیسی بندریا لگ رہی ہوں، کرشن کی مورتی کو رنگ لگاتے لگاتے خود کے منہ کو لال، پیلا، نیلا بنا ڈالا۔ باپ رے۔''

وہ بھی میری کھلکھلاہٹ میں شامل ہوگئی۔

وہ واش بیسن میں ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔ ہاتھ اور چہرے کا رنگ دھوکر صاف ستھری ہوکر۔۔۔صوفہ پر وہ میرے ساتھ آ بیٹھی۔

''ایک بات پوچھوں، منجو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں ، ہاں بے جھجک پوچھو،'' منجو نے کہا،''تم اکیلی کیوں رہتی ہو منجو؟ بہو بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں رہتی ہو؟''

''میں آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں دیدی، کیا دو سوتنیں ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے رہ سکتی ہیں؟''

''کون سی سوتن ؟ مجھے اُلجھاؤ مت منجو ۔۔۔کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔''

''حیران ہوگئی نا آپ ۔ میری بہو نے مجھے اپنی سوتن ہونے کا الزام لگایا ہے۔ وہ بھی اپنی ہی زبان سے۔''

''تمھاری بہو نے الزام لگایا اور بیٹے نے روکا نہیں؟ وہ تو تمھیں بہت پیار کرتا ہے، عزت دیتا ہے۔'' میں نے غصّے بھری آواز سے کہا۔

''ہاں ! وہ تو حیران رہ گیا تھا۔ بیوی پر ہاتھ بھی اٹھالیا۔'' منجو نے کہا۔

''پھر''؟ میں نے پوچھ لیا۔ ''پھر کیا وہ رونے لگا، بیوی کو کہنے لگا،''میں نے تو شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، ماں کے قدموں میں پڑا رہوں گا، بیوہ ہوتے بھی باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دی، پگلی یہ تم کیا بکواس کررہی ہو؟''

''معافی مانگ ماں سے'' میرے بیٹے انوپ نے بیوی سے کہا! اور بہو نے معافی مانگ لی ، میرا بیٹا اس رات میرے سر کو گود میں رکھ کر بیٹھا رہا، میرے سر کو سہلاتا رہا۔

پاگل ہے میرا بیٹا۔ اتنی محبت اپنی ماں سے کوئی مشکل سے کرتا ہوگا۔''

''ہاں منجو، تم خوش قسمت ہو۔'' میں نے منجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیدی، یہی ممتا اور محبت میری بہو سمجھ نہیں پارہی تھی۔ اس کے میکے میں ایسے گھریلو ماحول کی کمی تھی شاید وہ ان رشتوں میں پلی بڑھی نہیں تھی۔ شک اور وہم کی وجہ سے اس نے بھیانک روپ اختیار کرلیا۔''

''معافی تو مانگ لی پھر کیا گل کھلایا تمھاری بہو نے''؟ میں نے صراحی سے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے منجو سے پوچھ لیا۔

''کچھ دنوں کے بعد بہو نے طلاق کی دھمکی دے دی ۔ میرے بیٹے اور میرے بیچ میں

ناجائز تعلق ہے ایسا کہہ کر بدنام کرتی رہی، شہر بھر میں ناک کٹوا دی ہمارے خاندان کی'' منجو کو رونا آ گیا، آنسوؤں کا سیلاب تھمتا ہی نہیں تھا۔ سسکیوں کے بیچ وہ کہتی رہی۔

''دیدی، اس لیے میں خودکشی کر کے اپنے بیٹے اور پوتے کی بھلائی کیلئے مرنا چاہتی ہوں۔''

''پاگل ہوگئی ہو؟ چپ ہو جاؤ۔ اس مسئلے اور پریشانی کا کوئی نہ کوئی اچھا اور صحیح حل ضرور نکل آئے گا؟ میں ایسا ہونے نہیں دوں گی، منجو ۔۔۔ پرماتما پر بھروسہ رکھو۔'' میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

میں نے اپنی گھڑی میں دیکھا۔ کافی وقت ہو چکا تھا۔ سانجھ ڈھل چکی تھی، رات ہونے والی تھی۔ ''دیا بتی کا وقت ہو گیا ہے، منجو ۔۔ اُٹھ بھگوان کی آرتی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں بھی اپنے گھر جاتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' اور میں گھر جانے کو تیار ہوگئی۔

گھر آنے پر خط ملا، دلّی سے میرا میرا خاندان ماہ مئی کی چھٹیاں گزارنے پونہ آ رہا ہے۔ میرے بچوں کو بھی چھٹیاں مل گئی تھیں۔ تو ۔۔ ایک سوا مہینہ چھٹیوں میں گزر گیا۔ ستسنگ وغیرہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ ماتھیران، مہابلیشور، لوناولہ، ممبئی گھوم کر آئے۔ یہ چھٹیاں بہت اچھی گزر گئیں۔

میں ایک دو مہینے سے منجو سے مل نہیں پائی تھی۔ اسے بہت یاد کرتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک دن جب میں اس کے گھر گئی، گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسیوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ پندرہ بیس دن ہوئے وہ کہیں باہر چلی گئی ہے۔

میں نے پوچھا، ''کہاں گئی؟ کچھ معلوم ہے''؟

انھوں نے کہا، ''معلوم نہیں۔ کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں۔''

ایک دن کوریئر والے نے لفافہ تھما دیا نام اور پتہ دیکھ کر میں چونک گئی۔ لفافہ لے کر میں اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ اندر سے کڑی لگا کر، بے فکر ہوکر میں پلنگ پر لیٹ گئی۔ خط منجو کا

تھا، جو ناگپور سے لکھا گیا تھا۔

''ایک ہی شہر میں رہ کر میری بہو کے تہذیب و اخلاق اور اس کی اُڑائی ہوئی افواہ کا مرتے دم تک اس کی تنقید کرتے رہنا۔ یہ سب ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ میں اپنی وجہ سے ایک خاندان توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ باقی راستے خودکشی، وِردھ آشرم میں جا کر رہنا، کسی ستسنگ کے آشرم میں رہنا، مجھے نہیں جچے۔'' میں بدبدائی تم نے صحیح قدم اٹھایا منجو۔۔

منجو نے خط میں لکھا تھا، ''اپنے بیٹے اور پوتے کی بھلائی کے لیے میں نے شہر چھوڑ دیا ہے۔ اب پرسوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں یتیم بچوں کی استانی کی نوکری شروع کرنے جارہی ہوں۔ اس کا پتہ میں کسی کو بھی نہیں دینا چاہتی، بھگوان کرے میرا بیٹا اور اس کا خاندان پھلے پھولے۔

باقی بچی ہوئی زندگی ان یتیم بچوں میں اپنا ہنر اور ممتا دے کر اچھے اخلاق دے کر پیار دے کر، دوسروں سے پیار لے کر خوبصورت زندگی جینے کا ارادہ کیا ہے۔ آج میں پُرسکون زندگی اور روحانی سکھ کا تجربہ حاصل کر رہی ہوں۔''

میں نے خط پڑھ لیا۔ تھوڑے وقت کے لیے آنکھیں موند کر لیٹی رہی۔ پھر اٹھ کر تھوڑی فریش ہوگئی، کمرے سے نکل کر باورچی خانہ میں گئی۔ بچے پیٹ میں چوہے دوڑنے کا شور مچانے لگے۔

آنکھوں کے سامنے منجو کا خاموش، اطمینان سے بھرا چہرہ گھومنے لگا۔ اس نے نئے رشتے جوڑنے کا ارادہ کرلیا ہے، صحیح ارادہ بہت سارے یتیم بچوں کی ماں بن کر انھیں آگے پیار اور عزت، زندگی دینے والی استاد، اپنی زندگی کی صحیح قیمت ادا کرنے والی منجو کے لیے میرا دل فخر، خوشی اور عقیدت سے جھک گیا۔ اور نئے رشتوں کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگی۔

قدرت کا کرشمہ

قدرت کا کرشمہ

''دیکھیے ، میم صاحب! یہ فوٹو دیکھیے صاحب ، یہ فوٹو۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔ دس سال کی عمر کا وہ بچہ۔۔ پھٹے ، چیتھڑے جیسے کپڑے، دونوں ٹانگیں کٹی، گھٹنوں کے بل اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے پاس بڑے سے کچھ فوٹو تھے جنھیں دِکھانے کے لیے وہ گڑگڑا رہا تھا۔

وہ بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیراتے ہوئے کہہ رہا تھا،''بھوک لگ رہی ہے، یہ فوٹو دیکھو میم صاحب'' وہ کچھ اخبار بیچ رہا تھا۔

''اس تصویر کو دیکھ کر کچھ پیسے دے دو، بھوک لگی ہے۔'' مجھ سے نہ رہا گیا۔ آج رک ہی گئی اس کی آواز پر۔ نہ جانے کیسا درد تھا اس کی آواز میں۔

میں نے کچھ روپے اسے دے دیے، اس کا بیمار دبلا چہرہ کھل اٹھا۔ جیب میں پیسے رکھ کر اس نے کہا۔ ''میم ساحب یہ فوٹو دیکھو۔''

میں نے فریم میں جڑا ہوا فوٹو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کسی اخبار سے کٹا ہوا وہ فوٹو تھا۔ ناک میں نلیاں ہاتھوں پیروں پر پلاسٹر، آکسیجن کی نلی نتھنوں میں تھی۔

''میں نے پوچھا، یہ کس کا فوٹو ہے؟ کیوں دکھا رہے ہو؟''

''یہ میرا فوٹو ہے۔ یاد نہیں میم صاحب بارہ سال پہلے گجرات میں زلزلہ آیا تھا، میں تب چھوٹا سا دو سال کا تھا میم صاحب، اس لیے آپ میرا چہرہ دیکھ رہی ہیں تو بھی پہچان نہیں پا رہی ہیں۔''

''ہاں بچے میں تمھیں پہچان نہیں پا رہی ہوں، کون ہو تم''؟

اس بچے نے پہچان بتاتے ہوئے کہا، ''یاد ہے آپ کو؟ ٹی وی کے سنچا لک نے بہت ہی حیرت بھری آواز میں کہا تھا، گجرات کے اس زلزلے میں ایک ننھا سا بچہ تین دنوں کے بعد ملبے میں دبا ہوا ملا، اسے نکالا گیا وہ ڈاکٹروں کی مدد سے بچ گیا تھا۔ ٹی وی والوں نے کلوزپ پر کلوزپ لے کر کہا، نصیب والا بچہ! ایشور کی مہربانی سے ہمارے نوجوانوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے اسے بچالیا۔

ٹی وی، ویڈیو نے اسے قدرت کا کرشمہ مانا، لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبائیں، قدرت کا کرشمہ دیکھو ماں باپ چل بسے، پورے خاندان میں صرف ایک ننھا سا بچہ بچ گیا۔

میرے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کو دیکھ کر وہ بچہ کہنے لگا اب میں بڑا ہو چکا ہوں، میں وہی بدنصیب ہوں، اور آج ان اخباروں کی کٹنگ اور فوٹو دِکھاکر پیٹ کی آگ بجھا رہا ہوں۔ اخبار اور ٹی وی کی دنیا میں ایک دو دن کے لیے بنا ہوا ہیرو۔۔۔آج زیرو ہوں۔

زلزلے کے دو چار دنوں کے بعد ہی وہ ہیرو سے زیرو بن گیا تھا۔ زخموں کا زہر اس وقت اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا اور احتیاط کے طور پر اس کے پیر کاٹ دیے گئے تھے۔ یتیم کبھی اس ہاتھ کبھی اس ہاتھ پلتا۔۔ سڑک پر پھینکا گیا تھا۔ ''بس اب اپنے پرانے فوٹو اور کچھ اخبار کی کٹنگ کو لے کر بھیک مانگ رہا ہوں، میں یتیم قابلِ رحم، لاچار، بے بس، بھوکا کچھ دنوں کا ہیرو کسی چمتکار سے بچ تو گیا۔ زمین پر بوجھ۔۔۔ اَن چاہی زندگی جی رہا ہوں۔''
اس لڑکے نے میرے ہاتھ میں اخبار کی کاپی تھما دی، ''دیکھئے میم صاحب!''

مجھ میں اور کچھ سننے کی طاقت نہیں رہی۔ میں نے اسے رحم اور محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ گجرات کے زلزلے سے متاثر اس مظلوم بچے کے ہاتھ میں کچھ روپے تھما کر میں اپنے راستے پر چل پڑی۔

گھر آ کر میں نے اس لڑکے کے دیے ہوئے ایک اخبار میں اس کے فوٹو کے ساتھ

ایک بوڑھی عورت کا فوٹو بھی دیکھا، جو اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھی، جس میں یہ چھوٹا اپاہج لڑکا تھا۔

اخبار میں لکھا تھا کہ وہ بوڑھی عورت زلزلے میں بچ نکلی تھی وہ ساتویں منزل سے گری تھی۔ دو دن ملبے میں دبی رہی۔ پھر ملٹری کے نوجوانوں نے ٹریکٹر کی مدد سے اسے نکالا۔ پھر اس کے اسپتال میں بھرتی ہونے پر اس کا بیان لینے کے لیے ٹی وی، ریڈیو اخبار والوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ وہ کیسے بچ گئی؟

اس کی نانی نے کہا ''اس وقت میں پوجا کر رہی تھی۔ اچانک! بہت زور زور سے زمین ہلنے لگی۔ ایک پل میں میرے ہوش حواس اڑ گئے اور پھر میں نے اپنے آپ کو گہرے اندھیرے میں گھرا ہوا پایا۔ میرے ہاتھ میں بھگوان کا فوٹو تھا۔ اور اب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسپتال میں دیکھ رہی ہوں۔

ٹی وی والوں نے اس سے سوال کیا، ''کون سی شکتی نے آپ کو بچایا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان کا نام لیا، سب نے واہ واہ کی۔ تالیاں بجائیں اور قدرت کے کرشمے کا گن گان کیا۔

اس بوڑھی عورت کے خاندان کا کوئی آدمی جب اسپتال میں ملنے نہیں آیا تو وہ چونک پڑی۔ علاج کے دوران جب اسے پتہ چلا کہ زلزلے نے اس کے سارے خاندان کو نگل گیا ہے۔ تو وہ بے ہوش ہوگئی۔۔ کئی دنوں تک وہ بے ہوش رہی۔ اس کے جینے کی چاہ بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے جب وہ صحت یاب ہوئی تو اسے ذرا بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے، اسپتال سے ٹھیک ہونے کے بعد جب اسے اپنے، مرے ہوئے نوجوان بیٹے، بیٹیاں اور پوتے پوتیوں کے بنا جینا اچھا نہیں لگا تو خودکشی کو گلے لگا لیا۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کاش! اس کے اسپتال میں بھرتی کے وقت ہی سماج

سیوک ان سے ملتے۔ مدد دینے کا یقین دلاتے یا اپنے گھر میں لے جاتے۔تو شاید قدرت کا کرشمہ کہلانے والی بوڑھی نانی کچھ وقت تو اور جی لیتی۔

ویسے ہمارے پڑوس میں گجرات کے زلزلے سے ایک دس گیارہ سال کے عمر کی لڑکی بھی لائی گئی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر والوں کو کھو چکی تھی۔

پڑوسن نے بتایا کہ وہاں ہزاروں ایسے بچے تھے جو یتیم ہو چکے تھے۔ ان کو گھر لے جانے کی اور گود لینے کی اجازت دی گئی تھی۔ کچھ لوگ چھوٹے لڑکے لڑکوں کو لے آئے تھے۔ لیکن اپنا بیٹا یا بیٹی بنانے کے لیے نہیں بلکہ گھروں میں کام کاج کروانے کے لیے۔ اور وہ بچے سچائی جان کر کہ وہ صرف نوکر ہیں۔ تھوڑے ہی مہینوں میں گھروں سے بھاگ کر کہیں بھی جانے کو تیار تھے۔

ہم جیسے لوگ کچھ لمحوں کے لیے اپنے گھر میں ٹی وی دیکھتے ہوئے ان لوگوں سے کتنی ہمدردی جتاتے ہیں۔ ان کے بچ جانے پر مندر میں دعائیں، مسجدوں میں نمازیں، چرچ میں موم بتیاں جلاتے ہیں۔ جس میں ہم کچھ پلوں کے لیے جذباتی ہو اٹھتے ہیں۔ روتے ہنستے ہیں۔ پھر کھانے پینے میں اور دوسری روز مرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں جو اخباروں میں پڑھتے ہیں وہ محض ہماری بحث کا حصہ بن جاتا ہے۔ اتنے لاکھوں لوگ جو کسی بھی حادثے سے بچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ تین دن کا لڑکا بڑا ہو کر اتنی لاچاری اور مجبوری کی زندگی جی رہا تھا۔ اور وہ بوڑھی نانی جس نے خودکشی کر لی تھی۔

یہ لاتعداد یتیم لڑکے لڑکیاں نہ جانے کس حالت میں بھارت یا دنیا کے کسی کونے میں کیسی زندگی جیتے ہوں گے؟ کیا ہم پل بھر کے لیے ان قدرت کے کرشموں کو محسوس کر سکیں گے؟ اس کا کوئی ٹھوس حل ڈھونڈ سکیں گے؟

ڈاکے، زلزلے، باڑھ، زنا، دہشت گردی، بم دھماکے ہمارے لیے محض خبریں بن چکے

ہیں۔ ایک ضلع میں ایسا ہوتا ہے اس کا درد دوسرے ضلع کے لوگوں تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ بھارت ایک ہے۔ ہم سب صرف ایک ضلعی نہ ہوکر بھارتی ہیں۔

زلزلے، باڑھ، زمین کا ہر قہر جو آج گجرات میں ہوا، جو اُن پر گزری وہ ہم پر بھارت بھر میں یا دنیا کے کسی کونے میں کسی پر بھی گزر سکتی ہے۔ آج ہم، کل تم! جو اس کہانی کے کرداروں پر بیتی ہے۔

پل بھر کے لیے ہم آنکھیں بند کر کے اس احساس کو محسوس کریں۔ ہم میں سے کسی کی بھی یہ آپ بیتی ہوسکتی ہے۔ اس حالت کا کوئی ٹھوس حل ڈھونڈ سکیں گے۔ ان حالتوں میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کا کوئی اچھا حل ۔۔؟ کوئی سجھاؤ۔۔۔؟

بے گھر
SANJAY WAGH.

بے گھر

''میم صاحب مجھے اپنے پاس رہنے دو، میں لاوارث ہوں! میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔''

''چھٹے کام کر کے پیٹ پالتی رہتی ہوں! اور رات کو کہیں بھی جا کر کدھر بھی سو جاتی ہوں۔''

''جس موبائیل سے میں بات کر رہی ہوں، وہ میری خالہ کے بیٹے کا ہے جو دو، تین لڑکوں کے ساتھ رہتا ہے۔ میں کبھی کبھی وہاں بھی ان کے گھر کے کسی کونے میں سو جاتی ہوں۔''

ایک، دو تین نہیں دس پندرہ بار دل کو ہلانے والی درد بھری آواز کا فون مجھے لگاتار دو، چار دنوں سے آتا رہتا تھا۔

''میں کیا کروں؟ دو تین دن پہلے ہی ایک مقامی اخبار میں میرا اشتہار پڑھ کر رتنا گیری سے ایک لڑکی سامان کے ساتھ میرے گھر آ پہنچی تھی۔

وہ کہنے لگی ''مجھے کام اور چھت کی بہت ضرورت ہے'' میری ماں بیوہ ہے۔ ان کی ہم تین لڑکیاں ہیں۔ میرا کام چھٹ چکا ہے۔ میں جلد ہی کام پر لگ جانا چاہتی ہوں۔''

میں نے اپنے آپ کو سامنے رکھے ہوئے آئینے میں دیکھتے بالوں پر کنگی پھیرتے ہوئے اسے پوچھ لیا،''میں نے تو اخبار میں اشتہار دیا تھا، درمیانی عمر والی، بنا کسی بندھن کے، اچھا کھانا بنانے والی، گھریلو کام میں چاہ رکھنے والی، ذمہ داری سے گھر کا کام کرنے والی عورت کے لیے۔ تم تو چھوٹی لڑکی ہو، جس کو میں کام پر نہیں رکھنا چاہتی۔''

''تمھاری شادی ہونے والی ہوگی؟ ایک دو سال کے بعد تم چلی جاؤ گی۔ یا پھر ہوسکتا ہے کوئی اور باتیں ہوتی رہیں گی۔''

اس نے کہا، ''میں بالکل شادی کرنے والی نہیں ہوں۔''

میں نے کہہ دیا، '' کچھ دن تک میں تمھیں پرکھوں گی اور سوچوں گی پھر رکھ لوں گی۔''

مجھے باہر بہت سارے کاموں سے فارغ ہونا تھا۔ تو میں گھر کی صاف صفائی کرنے کا حکم دے کر جھاڑو، کٹکا، فنائل کی بوتل اسے دے کر گھر سے نکل گئی اور وہ کام پر جٹ گئی۔

میرے پاس بہت سارے کام کرنے کے لیے ضرورت مند لڑکیوں کے فون آنے لگے میں کچھ بہانے بنا کر ٹالنے لگی۔

پھر اسی لاوارث لڑکی کا فون آیا۔ جس کا نام کمل تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا، ''ایک سریتا نام کی لڑکی سامان لے کر بہت دور گاؤں سے میرے گھر پر آ پہنچی ہے۔ میں نے اسے گھر کے کام پر رکھ لیا ہے۔

مجھے گھریلو کام کرنے کے لیے ایک عورت کی ضروت تھی ۔ سریتا تو چھوٹی لڑکی تھی۔ اشتہار میں میں نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے لیے لکھا تھا۔

ایک دن پہلے کام پر رکھی ہوئی سریتا، ''ایک گھنٹے میں آتی ہوں'' کہہ کر اپنا سامان میرے گھر میں رکھ کر کہیں چلی گئی تھی ۔ اور دو، تین دنوں تک لاپتہ رہی۔ کوئی کھوج خبر بھی نہ دی۔ میرے گھر پر بہت سارا طوفان اٹھا۔ پولیس میں رپورٹ کرنے تک کی بھی باتیں چل پڑیں۔

میرا فون بجا۔ وہ کوئی عورت تھی ''بس ایک بار مجھے آپ سے ملنا ہے، میں آ جاؤں؟''

میں نے کہا، ''ٹھیک ہے، آ جاؤ۔''

کچھ گھنٹوں کے بعد وہ لڑکی جیسی نظر آنے والی عورت جس کا نام وندنا تھا آگئی۔ میں نے سوچ رکھا تھا، کہ اس لڑکی کے آتے ہی میں جلد سریتا کو کام سے ہٹا دوں گی۔ اور اس لیے میں نے اس عورت کو جس کا نام وندنا تھا اسے بلا لیا۔

وندنا ایک برابر قد کی ساولی لڑکی نما عورت میرے سامنے تھی۔ جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور وہ کوچ پر بیٹھ گئی، میں نے اسے پانی دیا۔

اس سے پوچھا" تم گھر میں ہی کیوں رہنا چاہتی ہو"؟

اس نے درد بھری آواز میں کہا،" میرے شوہر کا ایکسیڈنٹ وائی کے گھاٹ میں اسکوٹر چلاتے ہوئے ہو گیا تھا۔ مجھے ایک لڑکا بھی ہے۔ وہ تیسرے درجے میں وائی میں پڑھتا ہے۔

میرے ساس، سسر نے مجھے منحوس سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔ میری ماں بیوہ ہے۔ میں یہاں ہڑپسر میں اپنی خالہ کے پاس کسی طرح کام کر کے رہتی ہوں۔ اور اتوار کے دن اپنے بیٹے سے ملنے جاتی ہوں۔ جو میری ماں کے پاس رہتا ہے۔

میں نے اسے پوچھ لیا کہ،" تمھارا چھوٹا بچہ ہے۔ بیمار، ویمار پڑے گا تو اس وقت اپنی ماں کی ممتا کو تم کیسے روک پاؤ گی؟ کیا تم اس کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔"

میں نے اس کی پریشانیوں کو سن کر اسے کچھ سجھاؤ دیتے ہوئے کہا،" اپنی بیوہ ماں اور بچے کے پاس رہ کر ہی آس پاس کوئی کام ڈھونڈو۔ اور اپنے بچے کو پڑھاؤ لکھاؤ۔"

"تم اکیس سال کی عمر میں ہی ایک بیوی، ایک ماں اور بیوہ بن چکی ہو۔ یہ دیکھ کر مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے۔ لیکن میں تمھیں تمھارے بچے سے دور اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی۔"

اس نے میرا جواب سن لیا۔ میں نے اسے چائے بنانے کا حکم دیا اور چائے کے برتن، شکر، دودھ اور دوسری چیزیں اسے دکھا دیں۔ پھر اس نے میرے لیے اور اپنے لیے چائے بنا

لائی۔

میں نے دلاسا بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، اور اسے بس اسٹاپ تک چھوڑنے چلی گئی۔ بس کے آنے میں کچھ دیر تھی۔

میں نے اس سے بات کرتے ہوئے کہا، ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا، کہیں کام کرتے کرتے، کوئی بھلا سا انسان مل جائے جو خود بھی اکیلا ہو۔ جو تمھیں اور تمھارے بچے کو اپنا لے اور اس کا بھی کوئی بن ماں کا بچہ ہو اسے تم اپنالو۔ میں بھگوان سے تمھارے لیے دعا کرتی رہوں گی۔

وہ عورت، ماں اور بیوہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بس میں سوار ہوگئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ گھومنے لگا۔

سریتا آج اچانک ہی گھر پر آدھمکی۔ بکھرے ہوئے بال، چہرہ پریشان، آنکھیں لال، میلے کچیلے کپڑے۔

میں نے اسے ڈانٹ کر پوچھا، ''کہا غائب ہوگئی تھی؟'' یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ سامان رکھ کر ایک گھنٹے میں آتی ہوں کہہ کر کہا بھاگ گئی تھی؟ تمھاری ماں کا فون گاؤں سے آیا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر غصے میں ڈانٹتے ہوئے کہا 'ہم پولیس میں رپورٹ کرنے والے تھے ۔۔۔ کہیں کسی آدمی نے اغوا کر دیا یا خون وون!

وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ بولتی کیوں نہیں؟ بتاؤ کہاں غائب ہوگئی تھی؟ میں نے پوچھا۔

میم صاحب!''اس نے مجھے دھوکا دیا۔'' سریتا نے کہا۔ کس نے؟ میں نے پوچھا۔

''ایک سریش نام کے لڑکے نے ۔۔۔میں ماں سے لڑ جھگڑ کر رتنا گیری سے آپ کا اشتہار پڑھ کر پونہ اس کے لیے ہی آئی تھی۔ اسی سے ملنے گئی تھی۔'' اس نے کہا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔۔۔

''وہ تو شادی شدہ ہے۔ اس کے دوستوں سے پوچھ کر جب میں اچانک سریش کے گھر پہنچی تو ایک عورت بچے کے ساتھ اس گھر میں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ سریش کی بیوی ہے اور بچہ بھی اسی کا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے یہ اس نے کبھی بتایا نہیں تھا۔ اتنے میں سریش بھی وہیں آ پہنچا۔ مجھ سے کہا۔۔۔تم یہاں سے چلو۔

اس نے مجھے اپنے ایک دوست کے گھر رکھا، ہم دونوں رات دن جھگڑتے رہے۔ آخر ہمیشہ کے لیے رشتہ توڑ کر چلی آئی آپ کے پاس۔

اس کی باتیں سن کر میں نے غصہ کے مارے چیختے ہوئے اسے اپنے گاؤں ماں کے پاس جانے کو کہہ دیا۔ سامان دروازے سے باہر رکھ دیا۔ جلد گھر چھوڑنے کو کہہ دیا۔ اور وہ سامان اٹھا کر چلی گئی۔

پھر وہی چھوٹی سی لڑکی کا فون آ گیا، ''میں گھر سے نکل چکی ہوں، آپ کا پتہ دیجیے۔ میں آپ سے ضرور ملنا چاہتی ہوں۔''

یہ وہ لڑکی تھی جو پچھلے دس بارہ دنوں سے بار بار مجھے فون کر رہی تھی۔ اس نے اپنا نام کمل بتایا میں نے اسے 'ہاں' کہہ دیا۔

پھر اس کا فون آیا۔ ''میں بس سے ڈیکن تک پہنچی ہوں۔ میں آپ کے گھر تک کس بس میں آؤں۔ کوئی مجھے بس کا نمبر نہیں بتا رہا۔ رات ہونے کو آئی ہے۔ میں اس طرف کبھی نہیں آئی ہوں۔ واپس چلی جاتی ہوں۔ پھر کل سویرے آپ کے گھر پہنچ جاؤ گی۔ کون سی بس مجھے آپ کے گھر تک پہنچائے گی؟

میں نے کہا، ''مجھے بس کے نمبر معلوم نہیں۔ اس میں میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر پا رہی ہوں۔ تم جہاں ہو وہی پر رُکو۔ میں رکشا سے تمھیں لینے آتی ہوں۔ کہیں ادھر ادھر نہیں جانا۔''

میں ایسے دور سے گزر رہی تھی جس میں بہت ہی جذباتی، چڑچڑاپن سماج کے لیے

شکایت، غصہ، رونا سب باتیں میں اکیلی ہی جھیل رہی تھی۔

ایسے حالات میں بھی اپنے آپ پر قابو رکھ کر اس لاوارث لڑکی کمل سے ملنے چلی گئی۔ جس نے دس پندرہ دنوں سے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین لوٹ لیا تھا۔

میں نے موبائیل پر کمل سے پوچھ لیا کہ ''تم مجھے کیسے پہچانو گی اور میں بھی تمھیں کیسے پہچان پاؤ گی''؟

اس نے کہا ''میں بہت ہی دبلی پتلی ہوں، اور میں پیلے رنگ کا ٹاپ اور جنس پہنے ہوئے ہوں۔

میں نے رکشا کو کراس ورڈ نامی دکان پر کھڑا کیا۔ جیسے ہی میں رکشا سے اتری ایک نو دس سال کی چھوٹی لڑکی، پینٹ اور ٹاپ پہنے ہوئے، میری طرف دوڑی۔ ہاتھ میں موبائیل تھا میں سمجھ گئی یہی وہ لڑکی ہے۔ کمل!

میں نے اسے کہا، ''تم اتنی چھوٹی بچی ہو، میں نے تو اخبار میں بڑی عورت کے لیے اشتہار دیا تھا۔ تم میرے اتنے بڑے گھر کی ذمہ داری بالکل سنبھال نہیں پاؤ گی۔ پھر بھی چلو میں تمھیں اپنا گھر دکھاتی ہوں۔''

میں اسے اپنے گھر لے کر آئی۔ اسے بٹھایا اور پوچھا، ''تم بچپن سے لاوارث ہو، اس لیے کسی نہ کسی رشتہ دار کے گھر میں تو ضرور رہتی ہوگی؟ ورنہ تو لوگ تمھیں یتیم خانے میں ڈال دیتے تھے۔''

اس نے بتایا، ''کھڑک واسلہ کے پاس بہت چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میں ایک دور کے رشتہ دار کے پاس رہتی تھی۔ گاؤں میں کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔''

میں نے کہا کہ، ''میں تو سنتی آئی ہوں کہ کھیتوں میں کام کر کے بہت ساری عورتیں اور

لڑکیاں کم سے کم اپنا پیٹ تو پال سکتی ہیں۔تم یہاں کس کے پاس رہتی ہو؟''

دلّی کی کچھ کالج کی لڑکیاں ایک گھر میں کرایے پر رہتی ہیں وہاں میں رات کو کبھی کبھی سوجاتی ہوں۔ اور وہ دوٗر کا رشتہ دار کچھ لڑکوں کے ساتھ ایک کھولی میں رہتا ہے، کبھی وہاں سو جاتی ہوں مجھے ایک گھر چاہیے۔

پھر میں نے اسے کریدا۔ کیا تم کسی یتیم خانے میں رہنا پسند کروگی؟ تو میں تمھیں اس میں داخل کروادوں۔

کمل نے انکار کردیا۔

میں نے کہا،''تم کسی کے گھر میں ہی کیوں رہنا چاہتی ہو۔''

یتیم خانے میں رہ کر لاوارث ہونے کا اور اپنے ماں باپ کھونے کا احساس بڑھتا ہی جائے گا۔

میں ایک گھر ایک آدھار چاہتی ہوں۔ پیار اور ممتا سے بھری مالکن اور مالک۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوکر مالک مالکن کی چھتر چھایا میں بڑی ہونا چاہتی ہوں۔اس لیے مجھے ایک گھر کی تلاش ہے پیار حفاظت اور آدھار کی ضرورت ہے۔

میں تھوڑی سی جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کے سوال کا جواب سوچنے کے لیے گھر میں ہی چہل قدمی کرنے لگی۔ یوں میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔

بیٹا تم بہت ہی چھوٹی ہو، اپنے بڑے گھر گھرستی کا بوجھ اور ذمہ داری میں تمھارے کندھے پر نہیں ڈالنا چاہتی۔تم اپنی خالہ کے لڑکے کے پاس ہی چلی جاؤ۔

اس نے کہا کہ''یہ لڑکے مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ اور یہ رشتہ دار بھی دوسری جگہ کام پر جانے والا ہے۔ میں نے پوچھ ہی ڈالا''یہ لڑکے تنگ کرتے ہیں کا کیا مطلب''؟

''اب کیا سمجھاؤں آپ کو؟''

میں نے اس سے کہا کہ، ''مجھے ایسا لگتا ہے، تم اپنے گاؤں چلی جاؤ، وہاں آدھا پیٹ ہی سہی لیکن محفوظ زندگی جی سکوگی۔ اتنے بچپن میں ہی تمھاری ایسی حالت ہوگئی ہے۔ اور اب آگے تمھارے لیے شہر بھی محفوظ نہیں ہے۔

اس نے میری بات سے صاف انکار کیا اور کہا، ''میں دلّی والی لڑکیوں کے ساتھ دلّی چلی جاؤں گی۔''

میں نے اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا اور اسے ساتھ میں لے کر گھر سے باہر آئی۔ پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے کر رکشا میں بیٹھا دیا اور کہا ''جہاں تم رہتی ہو۔ پہنچ کر فون کرنا۔''

میں پہلے ہی ایک لڑکی سریتا سے پریشان تھی۔ اور اب دوسری لڑکی کا خطرہ مول لینا، میں نے ٹھیک نہیں سمجھا۔

میں سوچنے لگی، ''میں کب تک اس دھوکے بھری دنیا میں بھروسہ نام کی چیز لے کر جیتی رہوں گی۔ ایک ایسی آس میں کہ شاید میں کسی دکھی زندگی کا دُکھ دور کر پاؤں۔''

آج کل میں آس پاس کے رشتوں کی دنیا سے بھروسے کے نام پر اتنی ٹھگتی اور لٹتی جارہی ہوں۔ سچ مچ میں اندر سے ٹوٹتی جارہی ہوں۔ میرے دل میں اب بار بار یہی سوال اٹھتا ہے ''کیا اب دنیا میں سچائی، بھروسہ، رشتے، اپناپن کچھ بھی نہیں بچا ہے؟'' اگر بچا ہے تو یہ ایک عدد گھر کی تلاش اتنے سارے لوگوں میں کیوں آ گئی ہے؟ آخر وہ اپنا گھر چھوڑ کر نہ جانے کیا پانے، کیا حاصل کرنے کے لیے گھروں سے بھاگتے ہیں؟ لٹتے لٹاتے رہتے ہیں۔

یہ ایک بہت ہی سماج کا للکار سے بھرا ہوا سوال میرے دل میں اندر کھلبلی مچا رہا ہے۔ میں ان سوالوں کے جواب خود ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

گھر کی بیل بج رہی تھی۔ اپنے خیالوں کے تانوں بانوں سے نکل کر میں بھاگی۔ کوریئر والا آیا۔ ڈاکیومینٹس پر دستخط کر کے میں آنگن میں ٹنگے ہوئے جھولے پر بیٹھ گئی۔

اس کہانی کے مصنف سے میں پوچھتی ہوں آخر یہ کیا بات ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ اپنا گھر، اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر ایک گھر کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں؟

میں جھولے سے اٹھ گئی کچھ کپڑے بکھرے سوکھ رہے تھے۔ انھیں ٹھیک طرح سمیٹ کر لپیٹ لیا۔

مصنف ہی سوچے میری کہانی کے تینوں کردار اَن پڑھ سریتا، وَندنا اور کمل گاؤں سے بھاگ کر شہر آ گئیں۔ اپنی الگ الگ پریشانیوں کے لیے خون کے رشتوں سے بھاگ کر میرے گھر میں پناہ لینے۔ میں نے انھیں اپنے اپنے رشتہ داروں اور اپنے اپنے گھروں میں جانے کی صلاح دی۔

یہ باہر ملکوں میں بھاگتے ہوئے لوگ، یہ گاؤں سے بھاگ کر شہروں میں آتے ہوئے لوگ، کیا صرف پیٹ بھر روٹی کے لیے آتے ہیں؟ یا رشتوں سے بھاگ کر، یا آزادی اور صرف آزادی پانے کے لیے۔ یا سچ مچ کوئی مجبوری؟ رنگین سپنے؟ پڑھائی؟ بھاگ کر شادی کرنے؟ کون سا مقصد کون سی منزل کا تصور لے کر وہ شہروں میں آتے ہیں۔ گاؤں کو خالی خالی اور شہروں کو بھیڑ سے بھرتے جاتے ہیں۔

ایک رات

ایک رات

راجیش کی باتیں سن کر سیما غصّے سے آگ بگولہ ہوگئی۔ آج راجیش نے اپنی گرہستی کی پوری بنیاد ہی ہلا کر رکھ دی تھی۔ ایک بم دھما کہ کیا تھا اس نے۔

آج بھی وہ کئی مہینوں کی طرح آدھی رات کو گھر لوٹا تھا۔ سیما کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مینکا کے پاس تھا۔

سیما نے بگڑ کر کہا، ''مینکا کے پاس ہی رہ جاتے۔ گھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اس طوائف لڑکی سے کب چھٹکارا پاؤ گے؟''

راجیش نے سیما کو ایک طمانچہ مار دیا۔ اور کہنے لگا، ''خبردار جو مینکا کو طوائف کہا تو وہ بہت ہی خوبصورت ہے اور مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اس کے بال اور اس کے لباس بہت ہی پرکشش ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بہت پسند ہے۔''

سیما سسکنے لگی۔ طمانچہ لگنے سے اس کا تن من زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے غصّے بھری آواز سے راجیش کو کہہ ڈالا، ''تو کیا؟ تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟ گھر، گرہستی، بچے سب کچھ اس گندی لڑکی کے لیے چھوڑنا چاہتے ہو؟

راجیش نے غصّے میں آکر کہا ''ہاں، ہاں میں اسی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ تمھیں طلاق دینا چاہتا ہوں۔''

سیما نے حیرانی سے پوچھا، ''اس طوائف سے تم شادی کرنا چاہتے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کیا میں بھی ایک استانی نہ ہوکر ایک بازارو عورت بن جاؤں۔ اس کے جیسے کپڑے

پہنوں۔ اس کے جیسے اخلاق بنالوں۔ گھر اور بچوں کو چھوڑ کر بازار میں جا بیٹھوں! حیرت ہے کہ تمھیں اب ایسی غلیظ لڑکیاں اچھی لگنے لگی ہیں۔ تو آج سے میں بھی تمھاری پسند بننا شروع کرتی ہوں۔ طوائف بن جاتی ہوں۔"

راجیش نے طیش میں آ کر سیما کو کہہ دیا، "جا تو بن جا طوائف، مجھے تمھاری جیسی ساڑی واڑی پہنی، بالوں میں کیلو بھر تیل لگائی ہوئی، فیگر پر کوئی دھیان نہ دینے والی، پوجا کرنے والی، منگل سوتر پہنی، بڑا سا ٹیکا لگائی ہوئی عورت سے گھن آتی ہے۔ جو جی میں آئے کرو، میری پسند کی بنو۔"

سیما نے زور سے چلا کر کہا، "جاؤ اسی کے پاس۔"

راجیش نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا، "ہاں، ہاں جا رہا ہوں۔" اور اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

راجیش کے جملے پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح سیما کے کانوں میں بھر گئے۔ ہاں، یہ وہی راجیش تھا جو اسے کہتا تھا کہ تم اتنی خوبصورت اور پاکیزہ ہو کہ جی چاہتا ہے تمھیں برقعہ یا پردہ میں رکھ لوں۔ سیما جو راجیش کے پہلی بار چھونے سے ایسے شرما گئی جیسے لاجونتی کی بوٹی ہو۔ جسے یہ تک پتہ نہیں تھا کہ شوہر بیوی کے بیچ کیسا رشتہ ہوتا ہے۔ جو پاکیزگی کی پجارن تھی۔ آج اس نے راجیش کے منہ سے ایسے جملے سنے جس سے سیما کے دماغ میں چنگاریاں اُٹھنے لگیں۔

رات ہو چکی تھی۔ نیند سیما کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دوزخ کی آگ میں جلتی رہی، راجیش کی باتوں نے اسے بہت دُکھی بنا دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اس کے دل میں طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مٹانے پر تُل گئی تھی۔ اس کے بچے سوئے ہوئے تھے۔ ایک یہ ابھاگن تھی، جو جاگ رہی تھی۔ اُف! وہ پسینے میں پوری ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ اور پھر اچانک ایک بھیانک فیصلے نے اس کے من میں جنم لیا۔ وہ اُٹھی، بیگ اُٹھا کر اس میں

کچھ کپڑے بھرے، اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ ایک پاگل پن اس پر سوار تھا۔

اس نے حسرت بھری نظر سے اپنے کمرے کو دیکھا جس میں اَنگنت یادیں بھری ہوئی تھیں۔ جس میں اس نے راجیش سے بہت سی محبتوں بھری باتیں سنی تھیں جنھیں سن کر اس کے کانوں میں شہنائیاں گونج اٹھتی تھیں۔ دل میں گدگدی سی اٹھتی اور ایک نشے کے عالم میں وہ اس سے اور لپٹ جاتی اور خوبصورت سپنوں کی دنیا میں کھوسی جاتی۔ جہاں اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ دو بچے اور اس کا شوہر جن کے لیے وہ کھانا پکایا کرتی ہے، برتن مانجھتی ہے اور اس کی گود میں سر رکھ کر پوری دنیا کو بھول جاتی ہے۔

آج کچھ نہ تھا۔ شہنائی کی آواز روٹھ گئی تھی۔ سپنوں کی راکھ تھی اور گھر کے بدلے، آوارہ پن۔ اسے خوب ہنسی آئی۔ ہاں ہاں ہنسی۔ سیما کے لیے ہنسنے اور رونے میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ آنسو بہاتے بہاتے وہ تنگ ہو چکی تھی۔ جب کبھی درد اُٹھتا اس کے منہ پر درد سے بھری مسکان پھیل جاتی اور جب وہ درد سہہ نہیں پاتی تب ایک کھوکھلا قہقہہ جس میں ماتم کی آواز ہوتی لگا دیتی۔ اس نے اپنی گردن جھٹک دی۔

اب سیما نے یہی سوچا کہ ان خوابوں کا یعنی سکھی گھر گرہستی کا خاتمہ تب ہوگا جب وہ سچ مچ ہی طوائف بن جائے گی۔

طوائف! سبھی بدنامیاں یہیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اسے کوئی برا نہیں سمجھتا، کیوں کہ وہ برائی کا آخری نقطہ ہے۔ اس نے ارادہ کیا بس وہ اپنی پاکیزگی کو ختم کر دے گی جس کی وجہ سے وہ گھر اور بچوں کے لیے جھوٹے سپنے دیکھتی ہے۔ اس نے جھٹ سے بیگ اُٹھایا کچھ روپیہ لیے، اپنے آپ کو جان بوجھ کر ایک اَن دیکھی آگ میں دھکیل دینے کا فیصلہ کر لیا۔

باہر اندھیرا تھا، اس کا جسم کانپ اٹھا، من چاہنے لگا، دوڑ کر اپنے کمرے میں واپس چلی جائے یا پھر خودکشی کر لے۔ لیکن راجیش کے الفاظ اس کے کان سے ٹکرائے، ''میں سب کچھ

بھول چکا ہوں، مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا کہ میں نے تم جیسی عورت سے کیوں شادی کر لی، اور بچے بھی پیدا کر لیے۔''

اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ یوں ہی راستے پر بیگ تھامے کھڑی رہی۔ ایک رکشا والا مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا اور پوچھا،'' کہاں جانا ہے؟'' دل میں آیا وہ پاکیزہ فلم کا مینا کماری کا ڈائیلاگ دہرا دے،'' مجھے کسی قبرستان میں لے چلو۔'' ہاں وہ زندہ ہی قبرستان جیسی دنیا میں جگہ پانے کے لیے جا رہی تھی۔ وہ چپ رہی۔ رکشا میں بیٹھ گئی۔ رکشا والا سمجھ گیا کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے، رات کے اندھیرے میں بیگ ہاتھ میں تنہا عورت۔ معاملہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ یہ کوئی چالو قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

رکشا والے نے اپنے لہجے کو میٹھا کر کے کہا،'' کہاں جانا ہے''؟ سیما نے دل کی بات کہہ دی،'' مجھے اس جگہ لے چلو جہاں معصوم اور مجبور لڑکیاں طوائف بنتی ہیں، جہاں ان کے پاکیزہ ہونے کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لیے بھول جاتی ہیں کہ انھیں ایک شوہر، گھر اور بچے چاہیے۔ چلو بھیا مجھے اس گھنونی دنیا میں لے چلو۔''

رکشا والا لالچی ضرور تھا لیکن بھیا لفظ سن کر اور سیما کی ایسی باتیں سن کر اس کا ارادہ بدل گیا، انسانیت جاگ اٹھی۔ اس نے کچھ سوچا اور رکشا کو گندی گلیوں میں موڑ دیا۔

گندی گلیاں جہاں وہ لوگ آتے ہیں جو بیوی کے لیے پتی پرمیشور ہیں، معصوم بچوں کے لیے پتا جی ہیں، جو دن کے وقت شریف بنے پھرتے ہیں۔ اس رکشا والے نے جس کا نام سریش تھا، کپکپاتی سیما کا ہاتھ پکڑ لیا، اس سے کہا'' آؤ۔ پہلے میں تمھیں یہ دنیا دِکھا دوں۔'' سیما کے پاؤں ایک جگہ ٹھٹک گئے۔ کسی کے رونے کی آواز تھی،'' بائی جی آج میں دھندا نہیں کر سکوں گی مجھے معاف کرو، پورا جسم توے کی طرح جل رہا ہے۔''

بائی جی نے ایک لات جما کر بازارو زبان میں کہا،'' حرام زادی، نخرے دکھاتی ہے، یہی

تھا تو اپنے خاوند کو چھوڑ کر یہاں کیوں آئی، پورے پانچ ہزار میں تمھیں خریدا ہے۔ مریل کہیں کی۔ آج کھانسی ہے، آج بخار ۔۔۔! میرے گراہک توڑ دیے۔ جھٹ پٹ تیار ہوجا۔ رامو باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ پورے روپے دیے ہیں۔ رامو سے شراب کے نشے میں بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔ جلدی کر نہیں تو مار مار کر بھرتا بنادوں گی۔'' اور ایک اور لات جما دی۔

سیما یہ بھیانک منظر دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ کیا ہے؟ اس عورت کا پورا جسم بخار کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ بازارو عورت لڑکھڑاتے قدموں سے ایسے اُٹھی جیسے کوئی لاش اپنی قبر سے اٹھی ہو۔ منہ دھوکر، گرتی پڑتی اس نے پاؤڈر کا ڈبہ ہاتھوں میں لیا اور منہ پر تھوپ لیا۔ اس شرابی نے کمرے میں پاؤں رکھا، شاید کوئی فیکٹری میں کام کرنے والا تھا۔ اس کے کپڑے تیل میں لت پت تھے۔ آتے ہی اس پر جھپٹ پڑا، مانو کوئی بھوکا بھیڑیا ہو۔ جس کے سامنے کئی دن کے بعد کھانے کی تھالی آئی ہو، اس نے یہ بھی نہیں دیکھا اس کھانے کی تھالی میں کیا ہے۔

سیما کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے سریش رکشا والے کا ہاتھ تھام لیا۔ سریش سمجھ گیا اور اسے کہا، ''چلو دیدی گھر جائیں گے۔'' سیما کچھ سمجھ نہ سکی۔ وہ بے ہوش ہوتی جا رہی تھی۔ سریش کا ہاتھ تھام کر وہ رکشا میں بیٹھ گئی۔

سیما جب رکشا سے اُتری، اس نے سریش بھیا کا ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں شکریہ ادا کیا کہ اس نے بھائی کا فرض بنا راکھی باندھے ہی اچھی طرح نبھایا ہے۔ سیما کی حفاظت کی ہے۔

گھر لوٹ آنے کے بعد سیما نے دیکھا۔ دونوں معصوم بچے گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے اور راجیش اب تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ پلنگ پر آکر لیٹ گئی۔ آج وہ خاموش تھی۔ رات کے ماحول نے ایک بھیانک حقیقت دکھا دی تھی اور اب وہ اپنی زندگی میں لوٹ آئی۔

اِس جہنم اور گناہ کی دنیا سے یہ گھر، اس کی دیواریں، اس کی چھتیں، اس کی سیمائیں،

اس کی پریشانیاں، سکھ دُکھ سب بہت اچھے ہیں۔ وہ بدبدائی، ''جب جاگوں تب سویرا۔'' اور اس نے ہمیشہ کے لیے اس خیال کو دل سے نکال دیا کہ وہ طوائف بنے گی اور اس نے غصّے میں آ کر غلط حرکتیں پھر دوبارہ نہ کرنے کی ٹھان لی۔ ایک رات نے اسے کیا کیا کھیل دکھائے تھے۔ اُف! یہ کیا ہے۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ بے ہوش سی ہو گئی۔

صبح ہوتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اُٹھی، نہا دھوکر پوجا کی اور اُپواس رکھا۔ اور بچوں کو نیند سے اٹھا کر نہلایا، چائے ناشتہ اور روزمرہ کے کاموں میں جٹ گئی۔ ٹفن دے کر بچوں کو اسکول کے لیے روانہ کر دیا۔ اور سوچنے لگی، اسے بھی تو اسکول میں ایک دو گھنٹوں میں پہنچنا ہے۔ وہ استانی بھی تو ہے۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا راجیش تھا۔ سلوٹوں بھرے کپڑے، سر کے بال بکھرے ہوئے، اُترا ہوا چہرہ، دھنسی ہوئی آنکھیں، کاندھے جھکے ہوئے۔ گھر کے اندر آتے ہی اس نے سیما کو گلے لگا لیا اور پھر رونا شروع کر دیا۔

سیما نے راجیش کو سہارا دے کر صوفہ پر بٹھایا۔ پانی کا گلاس بھر کر اسے پلانے لگی۔ اسے پوچھا، ''کیا بات ہے؟ اتنے ٹوٹے بکھرے کیوں ہو؟'' راجیش پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہنے لگا، ''سیما تم نے سچ کہا تھا کہ مینکا ایک بازارو لڑکی ہے۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اسے کسی غیر آدمی کی بانہوں میں دیکھا ہے اور باہر بلا کے جب اس سے کہا کہ، ''میں تمھیں سچا پیار کرتا ہوں، بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے تمھارے پاس آ گیا ہوں۔'' تو اس نے میرے ہاتھوں کو جھٹک کر مجھ سے کہا، ''کیا بات کر رہے ہو؟ میں کبھی بھی کسی ایک کی بن کر نہیں رہنا پسند کرتی۔ میں ایک آزاد لڑکی ہوں۔ جہاں، جب تک جس کے ساتھ دل بہلتا ہے رہ لیتی ہوں۔ پیار دیار کے چکر میں کبھی نہیں پھنستی۔''

ایسی باتیں سن کر میں غصّہ میں پاگل ہو گیا۔ اس پر ہاتھ اُٹھانے لگا۔ اس نے زور سے

دھکیل کر مجھے چانٹا مارا اور کہا، ''میں تمھاری بیوی نہیں ہوں۔ کس پر حق جتا رہے ہو؟ تمھارے چرنوں کی داسی نہیں ہوں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے! ورنہ پولیس کو بلاتی ہوں۔''

راجیش نے سیما سے کہا، ''مجھے معاف کردو! ایک عیاش عورت کے جال میں پھنس کر میں نے تمھاری اور تمھارے جذبات کی بہت بے عزتی کی ہے۔''

سیما نے اس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی اور کہا، ''راجیش تمھیں پتہ نہیں غصّے اور غلطی میں میں جہنم جیسی گلیوں میں بھٹک گئی تھی۔ سوچتی ہوں کسی بھی عورت کو غصّے، غم یا گھریلو جھگڑوں سے اپنے گھر کی چوکھٹ پھلانگ کر رات کے اندھیروں میں گندی گلیوں میں بھٹکنا نہیں چاہیے۔ آج ایک بھیانک کالی رات نے میرے ہوش ٹھکانے لا دیے۔ سب کو سریش بھیا جیسا حفاظت کرنے والا رکشا والا نہیں ملتا، ایک رات نے کون کون سے تجربوں کے گُل کھلا دیے۔''

دونوں بغل گیر ہوگئے اور ایک ہی آواز میں ایک ساتھ بول اٹھے، ''رات کا بھولا صبح لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔'' اور پھر دونوں اپنی اپنی نادانی پر ہنس پڑے۔

ضمیر اپنا اپنا

ضمیر اپنا اپنا

کیا معلوم کیوں مجھے آج ایسا لگتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں، جو کچھ میرے آس پاس رونما ہو رہا ہے۔ سب کی سوچ کو محسوس کرنا، سمجھ پانا، سوچنا، ماں کی کوکھ میں ہی سمجھ میں آ رہا تھا۔

خیر، رحمِ مادر سے کٹنے کے بعد آواز سنائی دی، ''لڑکی ہوئی۔۔۔!'' نرس نے کہا۔

مختلف آوازیں بعد میں سنائی دیں۔ نااُمید، مصنوعی خوشی، کچھ آواز خوشی بھری ہوئی بھی۔

خالہ نے خوش ہو کر کہا، ''ارے واہ! لکشمی کا جنم ہوا اپنے خاندان میں۔''

پھوپھی منہ پھلا کر بولی، ''لڑکی باپ رے بھیا! آج سے ہی سر جھکانے کی عادت ڈال دے، ناک نیچا کروا دیا بھابھی نے تو۔''

نانی نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''ارے بہنا ایسا کیوں کہہ رہی ہو، عورت ہو کر ایک عورت کے پیدا ہونے سے اتنی ناراضگی۔''

دادی بولی، ''عورت ہی تو سمجھ سکتی ہے، کتنی تکلیفوں کی زندگی ہوتی ہے۔ لڑکی کا پیدا ہونا۔''

''جانے بھی دو، میں باپ بنا یہی خوشی کی بات ہے۔ اولاد کا سکھ تو ملا۔'' حالات کو سلجھاتے ہوئے پتاجی بولے۔

پتاجی کی باتیں سن کر ماما جی نے پیڑے کا ڈبہ کھول کر سب کا منہ میٹھا کروا دیا۔

بارہ، تیرہ سال کی عمر میں میں چاروں بھائی بہنوں سے بڑی ہو گئی۔ 'بڑی' میرا نام ہی

پڑ گیا تھا۔ حالانکہ میرا اصلی نام 'مدھو' رکھا گیا تھا۔ بہن کا نام سنیتا اور دو بھائی۔۔۔

میں پڑھائی میں بہت تیز تھی۔ گھر میں ماں سے ساری باورچی کرنا سیکھ گئی تھی۔ اکثر مجھے ہی رات کو کھانا بنانا پڑتا تھا۔ ایک ہی کمرہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ۔ چھوٹے سے گاؤں میں پتاجی ایک چھوٹی سی دکان میں کپڑے بیچا کرتے تھے۔

میں پاس میں گندھرو ودھالیہ میں موسیقی بھی سیکھتی رہتی۔ پڑھائی میں بہت اچھی ہونے کے لیے کالج پڑھنے کی بھی گھر سے اجازت مل گئی۔ کالج میں مجھے اسکالرشپ ملتی رہتی تھی۔ کتابیں بھی ملا کرتی تھیں۔ ماں صرف بس کا کرایہ دیا کرتی تھی۔ لگ بھگ مالی اعتبار سے میرا خرچہ ماں کے اوپر نہیں کے برابر تھا۔

لڑکیوں کا کالج تھا۔ وہاں مجھے پہلے دن ہی ایک ایسی سہیلی ملی جس نے میری آنکھوں کے اوپر ایک شعر لکھا اور کلاس ختم ہونے کے بعد مجھے دے دیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس لڑکی کی شکل میں میرے پچھلے جنم کا پیار مجھے مل گیا ہو۔ نہ صرف ہم اچھی سہیلیاں ہو گئیں، ساتھ ساتھ پڑھنا، ڈراموں اور رقص میں حصہ لینا، وقت ملتے ہی ایک دوسرے کے گھروں میں بیٹھے رہنا۔

میری سہیلی جس کا نام 'سیما' تھا۔ وہ ایک شاعرہ، ادیبہ اور بچپن سے ہی خود کفیل لڑکی تھی۔ جو کالج میں پڑھتے وقت بھی اسی ادارے کی اسکول میں استانی کا کام کرتی تھی۔ وہ بہت ہی چنچل، سنجیدہ، خوددار، ہنسمکھ، جذباتی اور ایک ذمہ دار لڑکی تھی۔ گورے رنگ کی درمیانی قد والی، خوبصورت اور نشیلی آنکھیں، گھنے خوبصورت بال، اس خوبصورتی میں لاوا بھی بھرا ہوا تھا۔

ایک دن ہم کالج سے ساتھ ساتھ گھر لوٹ رہے تھے تو ایک سائیکل والے لڑکے نے میری چوٹی کھینچی، سیٹی بجائی اور بھاگنے لگا۔ میں گھبرائی، سمٹی، ڈری، حیرت زدہ پتھر بنی کھڑی ہی رہ گئی۔

سیما نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سائیکل والے کو پکڑ کر اپنے جوتے سے اس کی پٹائی کر دی، اور پھر گردن پکڑ کر مجھ سے معافی منگوائی۔

اس لڑکے نے گڑگڑا کر کہا، ''مجھے معاف کر دو بہن۔''

''پاؤ چھوؤ اس بہن کے'' سیما نے گرجتے ہوئے کہا!

''میں دوبارہ کسی کے ساتھ ایسا نہیں کروں گا۔'' اس نے میرے پاؤں چھو لیے۔

لڑکیاں ایسی ہونی چاہئیں، جو لڑکی ہونے پر ناز کرے، جو میں نے اس دن سیما سے سیکھا۔

سیما نے ایک بار باتوں ہی باتوں میں مجھے بتایا تھا ''مدھو میں بہت پڑھ لکھ کر نوکری کر کے اور اپنے بڑے نام سے جینا چاہتی ہوں۔ اپنے شوہر کی دولت یا شہرت سے نام نہیں کمانا چاہتی ہوں۔''

''میں اپنے آپ کو بہت ہی پسماندہ سمجھتی رہتی ہوں سیما۔'' میں نے اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے پیدا ہونے کے وقت کی باتیں سیما کو بتا دیں۔

تمھیں تو اپنے گھر والوں کو ثابت کرنا ہے کہ لڑکی کسی لڑکے سے کم نہیں ہوتی۔

اس نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا ''دو تین دنوں میں میں تمھیں کوئی نوکری دلا دیتی ہوں، پڑھائی کے ساتھ ساتھ میرے جیسا معاشی استحکام بھی پاؤ اور خود کفیل بھی بنو۔

میری زندگی میں ان دنوں میرے ہی رشتہ دار کا لڑکا گوپال آ چکا تھا۔ میں اس کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ گوپال ایک دُبلا پتلا ، لمبے قد والا، شرمیلا، پڑھا کو قسم کا لڑکا تھا۔ وہ لکھنؤ سے پونہ پڑھائی کرنے آیا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ میرا گوپال سے پیار بڑھتا ہی گیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوکری میں نے سیما کے کہنے کے مطابق شروع کر دی۔ جو ہمارے گھر والوں کے لیے بہت ہی مشکل کام تھا۔ لڑکی کو اتنا پڑھانا، نوکری کروانا اور پھر اپنے پسند کے لڑکے گوپال سے شادی کرنے کا طے کرنا بہت ہی مشکل ہو رہا تھا ان لوگوں کے لیے۔

میرے گھر والوں اور رشتہ داروں کو میرا سیما سے اتنا میل جول بڑھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ ایک لڑکی ہونے کے باوجود مجھے لڑکے جیسے حقوق نہیں ملنے چاہئیں۔ اور یہ ساری بغاوتیں سیما ہی مجھے سکھا رہی ہے ایسا ان کا پکا خیال تھا۔ ان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ سیما خود لڑکے لڑکی کے پیار دیار میں بھروسہ نہیں رکھتی تھی۔

اب اور ایک بات میرے گھر میں شروع ہو گئی تھی۔ میری چھوٹی بہن سنیتا جو اب جوان ہو چکی تھی۔ اس نے دسویں پاس کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اور ماں کو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ اس نے دیکھتے دیکھتے اپنے رنگ بدل دیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں مجھ سے بہت حسد کرنے لگی تھی۔ اور کسی بھی طرح گھر والوں کا پیار حاصل کرنا اور مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اور مجھے ستانے کے لیے اس نے گوپال کو بھی اپنے ''پیار جال'' میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ نئے نئے طریقوں سے گوپال کا دل لبھانے لگی۔ میں نے اسے کئی بار ڈانٹا اور سمجھایا۔

اس نے مجھے کہہ دیا: ''ہاں، ہاں میں تم سے سچ مچ نفرت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم مجھ سے زیادہ خوبصورت، پڑھی لکھی اور کماؤ لڑکی ہو۔ میں گوپال کو بھی تم سے چھڑوا کے رہوں گی۔ میں تم دونوں کو ملنے نہیں دوں گی۔'' اس کا یہ روپ دیکھ کر میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

بہت ساری کوششوں کے بعد میں نے گھر والوں کو آخر منوا ہی لیا اور میری بھوک ہڑتال تڑوا کر ماں نے کہا، ''اچھا بابا جو جی میں آئے کرو۔ ہم تمھاری بات مان کر گوپال سے پوچھ کر اس کے ماں باپ سے مل لیں گے۔''

اچانک ! کبھی کبھی کچھ حادثے ایسے ہو جاتے ہیں کہ آسمانوں کو چھونے والے سپنے زمین پر گر کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ہو گیا۔ گوپال نے ایک دن مجھ سے جھگڑا کیا۔ اور باتوں باتوں میں اس نے کہہ دیا، "اسے میری چھوٹی بہن مجھ سے زیادہ پسند ہے۔ اور وہ اب اس سے پیار کرنے لگا ہے۔"

میں بہت ہی چکنا چور سی ہوگئی ۔ ٹوٹ گئی ، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور اپنی چھوٹی بہن سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اور ساتھ ساتھ گوپال سے بھی۔

گھر والوں کو جب یہ بھنک پڑی کہ گوپال مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اسے بھی ڈانٹنے اور پھٹکارنے لگے اور پھر اسی دوران میرے گھر والوں کے پاس میرے لیے ایک رشتہ بھی آ گیا۔ وہ لڑکا میری عمر سے لگ بھگ دس گیارہ سال بڑا تھا۔ ایگزیکیوٹیو انجینئر تھا۔ اچھا خاصا کماتا تھا۔ اِدھر میں بھی ضد میں آ کر ہاں کر بیٹھی۔ گوپال کو نیچا دکھانے کے لیے زیادہ خوش ہونے کا ڈرامہ کرنے لگی۔ گوپال کو یہ باتیں پسند نہیں آئیں اور وہ شہر سے دور کسی آشرم میں چلا گیا۔

گوپال کے جانے کے بعد میں اور زیادہ بکھرتی گئی۔ بیمار ہوگئی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی۔ میری سہیلی سیما سے میری حالت دیکھی نہیں گئی۔ ایک دن میرے ہی سامنے فون پر گوپال کو اس نے بتا دیا کہ "مدھو تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ یہ شادی کر کے مانو وہ خودکشی کر رہی ہے۔ یہ آگ مدھو کی بہن کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ مدھو سے جلتی ہے اور تمھیں مدھو سے چھین کر بدلہ لینا چاہتی ہے۔"

گوپال نے جب سچائی جان لی تو بہت رویا بہت پچھتایا گڑگڑایا۔ شکوہ، شکایت، رونا دھونا اور پھر میری شادی سے دس دن پہلے گوپال پاگل پن کی حالت میں واپس لوٹ آیا۔ پورا

مایوس، نااُمید ہوکر گھر والوں کو پھر سے کہنے لگا کہ مدھو سے مجھے شادی کرنی ہے۔

گھر والوں کا غصہ بہت ہی بڑھ گیا۔ کہ یہ لڑکا سنکی ہے کبھی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہے تو کبھی دوسری لڑکی سے۔ کبھی نوکری اور شہر چھوڑ کر آشرم میں چلا جاتا ہے۔ کوئی بھی اس کا قدم پکا اور یقینی نہیں ہے اور اس لیے گوپال کو پاگل سمجھ کر میرے گھر والوں نے دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ سیما نے اپنے پریمی دیپک کی مدد سے اس کا دماغی علاج کروانا شروع کیا۔ میری شادی رکوانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگی۔ لیکن سب بیکار تھا۔

میرے دل میں کوئی اُمنگ نہیں تھی۔ جسم برف کے مانند ٹھنڈا تھا مانو لاش جیسی بن گئی تھی میں۔ لیکن اسی حالت میں میری شادی کرادی گئی۔

پھر ہنی مون، پھر شوہر کے ساتھ مسوری، جہاں ان کی نوکری تھی۔ سال گزر گیا۔ میرا شوہر مجھ سے ناراض رہنے لگا کیونکہ میں ٹھیک طرح سے ایک بیوی کا فرض نہیں نباہ پارہی تھی۔ روز ایک نیا بہانا کرتی رہتی تھی۔ میں ماں بھی بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑی عمر کے تھے جلدی سے جلدی باپ بننے کی خواہش تھی ان کی۔ سب کچھ اجڑ رہا تھا۔ میری گوپال کی اور میرے شوہر کی تین زندگیاں وقت کے پہیّے میں پس رہی تھیں۔

جسم کی بیماری کی وجہ سے اور ڈر کے مارے مانعِ حمل گولیوں کا استعمال کرنے کی وجہ سے ایک آپریشن کروانا پڑا۔ سیما مسوری آگئی۔ میرا ساتھ دینے کے لیے اس نے بتایا کہ گوپال کا علاج کروانے سے وہ ٹھیک ہوگیا ہے، اس میں کافی بدلاؤ آگیا ہے۔ اسے اچھی خاصی نوکری لگ گئی ہے۔

سیما نے ایک پوشیدہ خبر بھی سنائی کہ میری ماں نے اس سے کہا، ''مدھو کی شادی تو ہوگئی، وہ اپنے گھر میں سکھی ہے۔ اب سوچ رہی ہوں کہ گوپال اچھا کما بھی رہا ہے۔ اس کا پورا خاندان لکھنؤ سے یہاں آگیا ہے۔ اب چھوٹی بیٹی سنیتا کی شادی گوپال سے کروا کر بے فکر ہو

جاؤں۔'' تمھاری چھوٹی بہن بھی اس رشتے سے خوش ہے۔

یہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ اتنی بڑی بے انصافی میرے ساتھ، گوپال کی زندگی میں کوئی اور لڑکی آئے، ایسا میں کبھی ہونے نہیں دوں گی۔ اور میری اپنی بہن گوپال کو حاصل کرے یہ میرے لیے نا قابلِ برداشت بات تھی۔

کچھ مہینوں بعد مَیں میکے آ گئی۔ گوپال سے ملی اور اس سے صاف صاف پوچھ لیا،'' کیا تم میری بہن سے شادی کر رہے ہو؟ گھر والے تمھاری شادی میری بہن سے کرنے کو راضی ہو گئے ہیں، کیوں کہ سنیتا نے خودکشی کرنے کی دھمکی دی ہے۔''

''پاگل ہوں کیا؟ میں تمھیں پیار کرتا ہوں، تمھاری بہن کے لیے میری وقتی کشش تھی، جب سیما نے سنیتا کا ارادہ بتا دیا تو میرے دل میں اس کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں رہی۔'' گوپال کہنے لگا۔

''اگر میں اپنی شادی توڑ دوں، جس سے میں بہت دکھی ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کروں گے؟

''ہاں، میں تمھارا ساتھ زندگی کے آخری دم تک دوں گا، تمھاری ہر مصیبت اور مشکل کو گلے لگا لوں گا۔ سماج اور گھر والوں سے مقابلہ کروں گا، بھاگوں گا نہیں، تمھارے مضبوط پیار سے یہ طاقت مجھے ملی ہے۔''

بعد میں میں نے اپنے شوہر کے بارے میں بہت ساری تہمتیں، الزامات، جھوٹے قصے گھڑ کر اپنے گھر والوں کو لاچار کر دیا اور بہت ہی پکے ارادے سے گھر والوں کو بتا دیا کہ میں اپنے شوہر سے قانونی طور پر الگ ہونا چاہتی ہوں۔ اور جلدی سے جلدی طلاق چاہتی ہوں۔

قانونی طریقے سے طلاق لینے میں ایک دو سال گزر گئے۔ میرے شوہر مجھے طلاق دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔

وکیلوں کے پینترے ، جرح، قانون کی باریکیاں، بیان بازی سے طلاق تو ہوگئی لیکن میرے شوہر اتنی شرمندگی، طرح طرح کے الزامات اور بہتانوں کو برداشت نہیں کر سکے اور موت کو گلے لگا دیا۔ انھوں خوکشی کرلی۔ میرے گھر والے رشتہ دار اور آس پاس رہنے والے دہل گئے۔ مجھے تو ہر حال میں گوپال کو حاصل کرنا ہی تھا۔

طلاق تو ہوگئی تھی لیکن گوپال کے گھر والے ایک طلاق شدہ لڑکی سے اپنے کنوارے اور اکلوتے لڑکے کی شادی کرنے کی بھرپور مخالفت کر رہے تھے۔

ساری رکاوٹوں کو پار کر کے ہماری شادی ہوکر ہی رہی، جس میں ہمارے دونوں طرف کے لوگ شامل تھے۔ کچھ دنوں تک سب آپس کے رشتوں اور معاملات میں تناؤ رہا۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہونے لگا۔ میں اپنی نوکری اور گوپال اپنی نوکری میں مشغول ہوگئے تھے۔ ہم دونوں، ساتھ ہی سارا شہر، سارے رشتہ دار اور سب گھر والے بھی ماضی کی ساری باتوں کو بھول گئے۔

گوپال اور میری شادی کو چار سال ہو گئے لیکن ہم ماں باپ نہیں بن سکے۔ کانا پھوسی ہونی شروع ہوگئی۔ ہم دونوں بھی چاہتے تھے کی اولاد ہو۔ ڈاکٹروں سے جانچ اور طرح طرح کے علاج کروانے شروع کردیے۔

دس سال گزر گئے شادی ہوکر اب مشکلیں شروع ہوگئیں۔ گوپال کا علاج، میرا علاج۔ ہاں ڈاکٹروں نے جانچ کے بعد بتا دیا تھا کہ میری بچہ دانی سکڑ چکی ہے۔ بہت علاج کروانے ہیں۔ آپریشن بھی کرنا پڑا۔ میں نے اپنے جسم کو چھلنی چھلنی کروا دیا۔ کوئی آس نہیں بچی، اولاد ہونے کی۔ سب علاج ہونے کے بعد بھی ہمیں اولاد نہیں ہو پارہی تھی۔

گوپال ماں باپ کا اکلوتا لڑکا، خاندان آگے کیسے بڑھے؟ نند، ساس سبھی ہم دونوں کی شادی سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب تو وہ بھی ٹوٹ پڑے مجھ پر۔ گوپال کے گھر والے اس کی

دوسری شادی کروانے کے منصوبے بنانے لگے۔ اس بیچ بچہ گود لینے کی بات چلی۔ میرے چار بھائی بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ گوپال کی چھوٹی بہن کو بھی بچے ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے بچے میری گود میں ڈال رہے تھے۔ لگ بھگ سارے ہی بچوں کے ماں باپ ہم دونوں بن چکے تھے۔

ماں بننے کی آس میں نے ماہواری بالکل ہی بند ہوجانے تک نہیں چھوڑی۔ اپنی کوکھ سے بچہ پیدا کرنے کا میرا وہم آخر ٹوٹ گیا۔

ہم نے پہلے سے ہی طے کر کے رکھا تھا کہ ہم کسی بھی رشتہ دار کا بچہ یا کسی جان پہچان والے کے بچے کو گود نہیں لیں گے۔ کیوں کہ بہت سارے گود لیے ہوئے بچے بڑے ہونے کے بعد اپنے سگے ماں باپ کو ہی اپنے ماں باپ سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ہم کسی انجانے، اندیکھے ماں باپ کے بچے کو ہی گود لینا چاہتے تھے۔

لڑکی ہونے کی تلخی کا اندازہ مجھے بچپن سے ہی غلط لگتا۔ اور اب میرا قطعی بھروسہ نہیں تھا کہ صرف خاندان بڑھانے کے لیے اولاد کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے اپنے عورت ہونے پر فخر تھا۔ گوپال بھی میری بات سے متفق تھا۔

سیما کی مدد سے اور اس کی چھوٹی بچی کی پسند سے ہم نے کسی یتیم خانے سے ایک لڑکی کو گود لے لیا۔ جو کسی بھی رشتہ دار کی یا جان پہچان والے کی بچی نہیں تھی۔ اس کا نام ہم نے 'کرانتی' رکھا۔

کسی یتیم بچے کے ماں باپ بننے سے ایک الگ ہی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس خوشی کو ہم نے محسوس کیا۔ ادھیڑ عمر والے ہم لوگ بھی اپنے آپ کو اپنی عمر سے دس پندرہ سال چھوٹے محسوس کرنے لگے۔

جس بات کو ہم اپنے دل سے قبول کر لیتے ہیں اسے سماج بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ بات

میں نے اپنے تجربے سے جان لی تھی۔ صرف ہمیں اپنے آپ پر اعتماد ہونا چاہیے۔

کیلنڈر کروٹ بدلنے لگا۔ گوپال کا تبادلہ الگ الگ شہروں میں ہونے لگا، جہاں ان کا تبادلہ وہاں ہم۔ سب ساتھ ساتھ۔ ہم دونوں میں ہم آہنگی بڑھتی جارہی تھی۔ ماضی کی کڑوی باتیں ہمیں بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھیں۔ دولت، شہرت، ایشور، عبادت، پیار، بھروسہ ہنسی خوشی سے ہم بھرے ہوئے تھے۔ بچوں جیسے کھیلتے کارٹونس دیکھتے۔ ہماری بچی کے ساتھ ہم بھی بچے بن گئے تھے۔ اور ہمارے خیالات میں بھی جوانی لوٹ آئی تھی۔

آج کرانتی دسویں جماعت میں ہے۔ گوپال اور میری آنکھوں میں جوان حال اور روشن مستقبل کے خوبصورت خواب سجے ہوئے ہیں۔ ایک میٹھاپن ہے ہماری سوچ اور خیالوں میں۔

آج سماج کی عدالت میں میں خود ہی کھڑی ہوکر پوچھ رہی ہوں؟ کیا کوئی خطا کی ہے میں نے؟ گوپال ارادے میں ڈگمگا گیا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کرا یگزیکیوٹیو انجینئر سے شادی کر لی۔ دل نہیں مانا، میں نے اپنے سات پھیروں والے شوہر سے کوئی تعلق دو تین سالوں تک نہیں جوڑا۔ شادی کا رشتہ توڑ کر گوپال کے پچھتانے اور واپس لوٹ آنے پر میں نے اس سے شادی کر لی۔ اُدھر میرے طلاق شدہ شوہر نے خودکشی کر لی لیکن میں خود کو ان کی موت کے لیے ذمہ دار نہیں مانتی کیوں کہ میں گوپال یعنی اپنے پیار کو کسی صورت میں بھی گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے پہلے شوہر کا پیار نہیں بن سکی تھی۔ یہ اس کی اور میری بد نصیبی تھی۔

میری چھوٹی بہن نادان تھی۔ اس کا گوپال سے شادی کرنے کا خیال صرف بچکانہ تھا۔ مجھ سے حسد، انتقام، گوپال کی کشش نے اس سے ایسی حرکتیں کروائیں۔ اس کی شادی جب ہم نے ایک اچھے لڑکے سے کروادی، تو وہ مطمئن ہوگئی۔

بے اولاد ہوکر بھی گوپال کی دوسری شادی کو رکوایا اور کسی بھی رشتہ دار کے بچے کو گود نہ

لے کر ایک یتیم بچی کو اپنا لیا۔

میں نے اپنی زندگی جی ہے۔ آج مجھے کسی سے، قسمت سے کوئی شکایت نہیں۔ پرماتما میں بہت بھروسہ اور یقین ہے میرا۔ اور اچھی خوبصورت زندگی جینے کی خواہش، نہ سماج سے کوئی شکوہ ہے نہ شکایت۔ میں اپنے ضمیر کے فیصلے پر ہی چلی ہوں۔ اب آپ ہی کریں گناہ اور ثواب کی وضاحت، صحیح غلط کی پہچان۔ آخر ہر ایک انسان کا اپنا اپنا ضمیر ہوتا ہے۔

اندرا شبنم اِندو- تعارف

نام : اِندرا پونا والا (شہداد پوری)

تخلص : شبنم

پیدائش : ۲۴رنومبر۔ بمقام کراچی (سندھ)

تعلیم : بی.اے، بی.ایڈ، ساہتیہ رتن سینئر سند (ہندی)

مطبوعہ تصانیف:

❖ شبنمی قطرہ (غزلیں، آزاد نظمیں)	سندھی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۱۹۹۱
❖ عبادت (کہانیوں کا مجموعہ)	سندھی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۱۹۹۹
❖ عبادت (کہانیوں کا مجموعہ)	ہندی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۰
❖ سلن جو سکھ (مجموعۂ کلام)	سندھی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۱
❖ تصویریں (مجموعۂ کلام)	ہندی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۲
❖ سلسلے (مجموعۂ کلام)	ہندی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۳
❖ سرگوشیاں (غزلوں کا مجموعہ)	ہندی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۳
❖ دستک (مجموعۂ کلام)	ہندی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۴
❖ سرگوشیاں (غزلیں/نظمیں)	اُردو	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۴
❖ عبادت (کہانیوں کا مجموعہ)	اُردو	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۶
❖ جاگیال ضمیر (مجموعۂ کلام)	سندھی	ایوارڈ سے نوازا گیا	۲۰۰۷
❖ میری منتخب نظمیں (نظمیں)	اُردو		۲۰۰۸

دیگر مصروفیات:

❖ رقص، ڈرامہ، ٹی وی اور ریڈیو پر پروگراموں میں شرکت۔

- ❖ قومی، بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت۔
- ❖ سندھی، ہندی، مراٹھی، اُردو و انگریزی میں نثر نگاری اور مشاعروں میں شرکت۔
- ❖ ادبی سیمیناروں اور جلسوں میں مختلف موضوعات پر پیپر پیش کرنا۔
- ❖ دلّی ساہتیہ اکادمی کی دعوت پر ادب اور کلچر کے لین دین کے لیے تین مرتبہ دہلی میں انڈو پاک سیمینار میں شرکت۔
- ❖ پانچویں، چھٹی اور ساتویں جماعتوں کے اسکولی نصاب میں اور ۲۰۰۴ء میں ریاست گجرات کے گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی نصابی کتابوں میں تخلیقات کی شمولیت۔
- ❖ روٹری کلب اُلہاس نگر کی جانب سے کئی ہندی، سندھی پروگراموں میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت۔
- ❖ Sparow Sound & Picture Archives for Research on Women کے لیے کاشد بیچ، علی باغ، کیمپ میں مختلف زبانوں کی شاعرات کے ساتھ شرکت۔
- ❖ Sparow نے ایک ڈاکیومینٹری فلم بنام 'ایک مہان استری ساہتیہ کار' بنائی۔ اسی طرح دو مختلف تنظیموں نے 'مہان استری ساہتیہ کار' کے طور پر ڈاکیومینٹری فلمیں بنائی گئیں۔
- ❖ بھوپال مدھیہ پردیش میں انڈو پاک سندھی شاعرات کے مشاعرے (۲۰۰۷ء) میں شرکت۔

مشاغل:

- ❖ پچیّس سال تک معلّمہ۔
- ❖ ایس ایس وائی یوگا کی ہیڈ مسٹریس اور منتظمہ۔
- ❖ ریکی ماسٹر، یوگا ٹیچر۔
- ❖ ایرو ڈا جیل کے لیڈیز وارڈ کی وارڈن۔
- ❖ روحانی معالجہ۔

قابلِ ذکر انعامات :

- دلی سندھی اکیڈمی سے سندھی زبان میں مجموعۂ کلام 'شبنمی قطرہ' پر 'ساہتیک یوگ دان' کا پندرہ ہزار روپے کا اِنعام۔
- ۲۰۰۱ء میں مہادیوی ورما سمستی پور بہار میں ہندی مجموعہ 'سلسلے' کو 'ساہتیہ شکھر' اعزاز۔
- ۲۰۰۱ء میں ہماچل پردیش سے 'عبادت' ہندی مجموعے 'ساہتیہ رتن' انعام۔
- ۲۰۰۲ء میں بین الاقوامی مانوادھیکار خاتون آفیسرز کی صدر۔
- ۲۰۰۳ء میں این.سی.پی.ایس.ایل بروڈا (گجرات) کی طرف سے سندھی کہانیوں کے مجموعے 'عبادت' پر بیس ہزار روپے کا انعام۔
- ۲۰۰۳ء میں کولہاپور اُدھیویشن میں ہندی ادب میں خدمات کے لیے A.I.P.C. کی جانب سے ایک ہزار روپے، شال، توصیفی سند، مومنٹو دے کر اعزاز کیا گیا۔
- ۲۰۰۴ء میں دلت ساہتیہ اکادمی دلّی کی جانب سے 'ساوتری بائی پھلے ایوارڈ'۔
- ۲۰۰۴ء میں بین الاقوامی مانوادھیکار سنگھ کے پونے ضلع مہیلا صدر عہدہ پر نامزدگی۔
- ۲۰۰۵ء میں ہندی پرسار وِترن ساہتیہ پرتشٹھان کھترانہ رائے بریلی یوپی کی جانب سے ادبی شری اعزاز۔
- ۲۰۰۵ء میں خانقاہ صوفی دیدار چشتی کی جانب سے ہندی مجموعہ کلام 'دستک' کے لیے 'ساہتیہ رتن' اعزاز۔
- ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ سنگم بال گھاٹ مدھیہ پردیش سے 'ساہتیہ ششی' اعزاز۔
- ۲۰۰۶ء میں سربھی ساہتیہ سنسکرت اکادمی کھنڈوہ مدھیہ پردیش سے 'ساہتیہ شکھر' اعزاز۔
- ۲۰۰۶ء میں بال گھاٹ مدھیہ پردیش 'سروشریشٹھ لیکھک' کا اعزاز۔
- ۲۰۰۶ء آل انڈیا بزم سعید جھمبوا کی طرف سے 'شانِ ادب' کا اعزاز۔

رابطہ: 9 - 1 B، میور بن اپارٹمنٹ، 1100، شیواجی نگر، ماڈل کالونی، پونے 411 016
فون نمبر: 25671039, 25652825۔ موبائل: 9422001711

ZAMEER APNA APNA

(Short Stories)

by

Indira Shabnam Indu